

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نام:	اسد اللہ خاں
عرف:	مرزا نوشہ
تخلص:	غالب
خطاب:	نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ
پیدائش:	27 دسمبر 1797ء، بمقام آگرہ
انتقال:	15 فروری 1859ء، بمقام دہلی

تصانیف:

- ۱- کلیات فارسی، جلد اول، دوم، سوم مرتبہ فاضل حسین کھنوی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء
- ۲- سید جیس (کلیات نظم کی طباعت کے بعد کچھ گئے فارسی اشعار) مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، مجلس یادگار غالب/پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
- ۳- درخش کا دیانی، مرتبہ پروفیسر محمد باقر، لاہور، مجلس یادگار غالب/پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
- ۴- دشتیہ، مرتبہ عبدالشکور احسن، لاہور، مجلس یادگار غالب/پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
- ۵- گل رعنا مع آشتی نامہ غالب، مرتبہ سید قدرت نقوی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء
- ۶- دیوان غالب بہ تصحیح متن و ترتیب حامد علی خاں، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۵ء
- ۷- مہر نیم روز

- ۸- انتخاب دیوان اردو
- ۹- انتخاب دیوان فارسی
- ۱۰- شیخ آہنگ (مجموعہ مکاتیب فارسی)
- ۱۱- قاطع برہان (فارسی لغت کی مشہور کتاب برہان قاطع کی انطاہ پر مشتمل رسالہ)
- ۱۲- بارغ دودر (اس میں آخری دور کے اشعار ہیں)
- ۱۳- اردو کے معنی (اردو خطوط کا مجموعہ جو مرزا کی زندگی میں مرتب ہوا لیکن اس کی طباعت مرزا کی وفات کے بعد مکمل ہوئی)
- ۱۴- عود ہندی (اردو خطوط کا مجموعہ جو مرزا کی وفات سے چار ماہ پیشتر میرٹھ میں چھپا)
- ۱۵- نکات و رقعات (قواعد فارسی سے متعلق ضروری ہدایات اور چند فارسی خطوط کا مجموعہ)
- ۱۶- قادر نامہ
- ۱۷- فتح تیز
- ۱۸- لطائف خمینی (میاں داد سیاح کے نام سے مرزا غالب نے شائع کی)
- ۱۹- کلیات نثر فارسی (شیخ آہنگ، مہر نیم روز اور دشتیہ کا مجموعہ)

غالب کی نثری اسلوب کی خصوصیات:

مثنوی عبارت آرائی - خطابیہ انداز - مکالمہ نویسی - جدت پسندی - غیر روایتی تشبیہات و استعارات کا استعمال - تمثیلات و علامات کا استعمال - ایجاز و اختصار - محاورے اور کہاوت کا برجستہ اظہار - گفتگو - بے ساختگی - بے تکلفی - نثر میں اشعار کا استعمال - مرقع نگاری - خرافت - ماحول کی عکاسی - جذبے اور احساس کی ترجمانی -

صوفیوں، متعلم اور دینی رہنماؤں کے اقوال اور احتمال اور مذہبی رسالوں نے امداد بخور فرمادیا۔ جب ہم یہ یاد دہندہ کی بات کرتے ہیں تو فوراً دیکھ کر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے جہاں میر شیر علی الموسوی، حیدر بخش حیدری، میر امن، المودالہ کی، خیال چند کی تصانیف نے سلاست سادگی، روانی بے سارنگی اور بے تکلفی پیدا کی۔ مرزا غالب نے حقیقتاً ان تصانیف کی تکرار پر حوا، استفادہ کیا اور اثرات انھوں نے اس روایت کو اپنے مخصوص انداز میں آگے بھی بڑھایا۔ میر تقی میر کے مقابلے میں بعد کی پیداوار ہے۔ نظم سکرانجی الوقت حق، ادبی ذوق رکھنے والے نثر کے لکھے جانے کے بعد بھی نظم کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ نثر میں لوگ فارسی کو ترجیح دیتے تھے۔ کتابوں پر دیکھنا ہے، تقریظیں اور خطوط یہاں تک کہ اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے اور اس میں نگہبوری، بیگل اور شیخ رشید کی تھیں نہایت صریح، مستقیم اور متفنی عبارات لکھنے کا عام رواج تھا۔ خود مرزا غالب نثر فارسی میں لکھتے تھے ان کی بہت سی تقریظیں، دیباچے فارسی زبان میں ہی ہیں اور اس میں انھیں اپنی فارسی دانی کے اظہار کے لئے نہایت محنت، مشقت، دیدہ وریزی اور دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۵ء میں اردو میں خطوط لکھنے شروع کئے۔

(مولانا غلام رسول مہر نے چند خط ایسے تلاش کئے جو غالب نے

۱۸۴۸ء میں لکھے۔ خطوط کی تلاش جاری تھی اور بہت سے لوگوں کے

خطوط بعد میں دستیاب ہوئے۔ لیکن اس دور کے خطوط زیادہ نہیں ہیں اور

باقاعدگی اور نہایت اہتمام کے ساتھ انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد ہی

اردو میں خطوط لکھنے شروع کئے۔) (ح۔ک)

اپنی جدت طراز طبیعت سے کام لیا اور انکی عباراتیں لکھیں کہ دوسروں نے ان کی تقلید کی لیکن غالب کی سی بات نہیں بنی۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ انداز ان سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہو گیا۔ سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ خطوط اردو نثر کے چار نمونوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور ایک سنگ میل کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ”اردوئے معلیٰ“ حصہ اول غالب کے انتقال کے ۱۹ روز بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء مطبع اکمل المطابع میں چھپ کر تیار ہوا۔ حصہ دوم ۱۸۹۹ء میں

ڈاکٹر حسرت کا سہنجوی

مطالعہ غالب خطوط کی روشنی میں

غالب اردو ادب میں روشنی کا وہ مینار ہیں جس کی روشنی سو سال گزرنے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی ہے ان کی خدمات کے اتنے پہلو ہیں کہ ان پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں ان کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوششیں کی گئیں ہیں۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، بات میں سے بات پیدا کرنے کا بہتر جانتے تھے، وہ زندگی کے مختلف رنخوں کو مختلف انداز سے دیکھتے تھے اور زندہ رہنے کے وہ ڈھلک اختیار کرتے تھے جہاں مایوسی اور ناامدادی نہیں تھی۔

غالب کی علمی اور ادبی حیثیت اپنے ہم عصروں میں نمایاں تھی گو کہ ان پر بھی فارسی کے اثرات شدید تھے یہ غالباً اس دور کی بات تھی جب ماحول اور معاشرے میں، علمی ادبی حلقوں میں فارسی کو بڑی مقبولیت حاصل تھی لیکن غالب نے اس بات کو جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف قومیں آباد ہیں، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں ان حالات میں فارسی کی جگہ اردو کو فروغ حاصل ہو گا۔ انھوں نے اردو میں خطوط شہری، دیہی، اس زمانے میں فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے لیکن غالب نے اردو میں خطوط لکھنے شروع کئے۔ ان کے یہ خطوط اس وقت کے لحاظ سے راز والے اور نادر تھے۔ طرز تحریر میں اتنی زیادہ تبدیلی ہے کہ یہ ایک نئی صنف کے طور پر سامنے آئے اور مقبول بھی ہوئے۔ نظم کی طرح نثر کے نمونے کی انہیں دکن میں ملتے ہیں وہاں کے ادیبوں کے علاوہ

مذہبی کھانا دینی سے تعلق ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی پہلے بھی کتب چھاپی گئیں۔
دوم میں خاص کر وہ اشاعت تھی جس میں انھوں نے لوگوں کو اسلام میں دینی اور دنیاوی کے
تعلق کوئی حاکمیت کی ہے۔ کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلی کتابوں کے پروجیکٹ میں اس میں ۵۰
تھیں اور ۵۳ اشاعتیں ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں قلعہ مبارک علی نے اس دور سے جب اسے
شائع کیا تو اس میں دونوں حصے تھے اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کر دیا جس میں پورے تاریخ شروع
۲۳ خطوط ہیں۔

مکاتیب غالب میں نواب یوسف علی خاں اور نواب کاب علی خاں فرما کر اعلان رام
پور کے نام غالب کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۷ء میں چھپا۔ انبار علی مرگئی نے ۱۸۱
مکتوبات کا دیا چھپا لکھا جس میں ان خطوط کی مدد سے غالب کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر
غور سے دیکھا جائے تو ان اشاعت کی ادبی حیثیت زیادہ نکلتی ہے۔ بعض اشاعت تو بے حد
مختصر ہیں اور کچھ اہم ہانکی ہندی کی رسید ہیں بھی ہیں کئی کئی علمی اور ادبی بات بھی ہے
یا کوئی قطعہ تاریخ شامل ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ غالب کا مخصوص اسلوب نگارش
اور عظمت ان تحریروں سے بھٹکتا ہے۔ اشاعت غالب کے اور بھی کئی مجموعے بعد میں شائع
ہوئے جن میں ہمیش پرشاد، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر گلشنی انجم کے مرتب کردہ مکاتیب
زیادہ اہم ہیں۔

غالب نے اس دور میں جن کتابوں کے دیباچے وغیرہ لکھے، ان میں ان کا طرز تحریر
وہی ہے جو اس کتاب کا ہے یعنی قافیہ بیانی اور عبارت آرائی اس لئے کہ یہی طرز تحریر اس
وقت سکھ رائج الوقت تھا اور یہی انداز پسند بھی کیا جاتا تھا۔ اس لئے غالب نے بھی اس سے
انحراف نہیں کیا۔ اندازہ کے لئے چند فقرے ملاحظہ ہوں:

”مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں فساد غالب بے نظیر ہے جس
نے میرے دعوے کو اور فساد غالب کی یکسانی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے۔ کیا
ہوا کہ ایک طرح اور ایک نقاش کے ہیں۔ یہ دونوں دلفریب نقاش ایک
ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے
ہیں کہ نقاش لا ثانی ہے مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ تیرہری کا

اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہے۔ یہ سب کچھ اس کی کتاب ”گلشنی انجم“ میں شامل ہے۔
فارس سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

”میرزا پرورد“ مصنفہ شب علی کچھ سیر کی کتاب ہے۔ یہ بھی لا کتبہ اور لا کتبہ
ہے اگرچہ اس کو چنانچہ لکھے ہیں لیکن اشاعت ایک مرتبہ کے لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔
ایک مکتوبی پر بھی لکھے ہیں کہ یہ اشاعتیں اس کا ہیں۔ یہ وہ دور ہے۔
اس وقت اس کا اس دور میں اس دور میں اس کا دور ہے۔ اس نے اس دور میں اشاعت
میرزا پرورد لکھے ہیں۔ یہ کتاب اس دور میں اشاعت ہے۔ یہ اشاعت اس دور میں
غالب کا دور ہے۔ اس کی تو چوں ہے کہ اس دور میں میرزا پرورد کا نام بھی میرزا پرورد
میں ہی بیٹھا ہے۔

”میرزا پرورد“ سعادت تو امان خواجہ بدرالدین خاں غفرلہ خاں نے لکھا کہ وہ ایک
جو ان شریں میں تیرہوش ہے اور ہر فن کی تحصیل میں تخیل میں تیرہوش ہے۔ اس کا جو خیال ہوا
ایسا بھلا کہ میں تان میں کو انگریزوں پر چھاپا۔ مشورہ کی جو طبیعت آئی وہ تصویر کشی کر اس کو
دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آج کا یہ ارادہ ہوا میرزا پرورد کی غرضی غرض
کرنے پر آمادہ ہوا۔ بعد اختتام نگارش غالب غلگ زدہ سے دیا چھ لکھنے کی آرزو کی۔ جس
نے ہر چند مجھ آ میرزا معذرت انگیز گفتگو کی۔ یہ اگر نے ایک بات نہ سنی اور ایک معذرت نہ مانا۔
بھلا اس اصرار کا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانہ۔ سچ کیا اور بیا را سچ کیا پھر عاصم فرمائی
کچھ بن نہ آئی۔ ایک نمونہ اور بھی ملاحظہ ہو حدائق الانصار تالیف خواجہ بدرالدین خاں کا
دیباچہ۔

”حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامہ در ہم پیچیدہ سر بستہ ہے کہ جس
کے عنوان پر لکھا ہے لاموثر فی الوجود اللہ اور خط میں مندرج ہے لاموجود اللہ اور اس نامہ
کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور نام آور کہ جس پر رسالت ختم ہوئی
--- اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سیرہ ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ اور سلطان باب
گنجینہ ہے۔ --- ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم المرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت
ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ اللعالمین ہونے کے۔ --- جب اولیاء نے کہ وہ

[illegible]

”۔۔۔ عطا اللہ رب العالمین اللہ تعالیٰ ہم پر فرزند و حافی و مضمونی ہے فرق اسی قدر ہے کہ میں جانتی ہوں اور ٹوٹو مولوی ہے، اسے ظالم کو سب پر اٹھیں کی داد دے۔ مصلحت کراست ہے

ایمان ہے اللہ جمیع ہے کما ہے؟

مرزا قمر بان علی بیک کو لکھتے ہیں :

”۔۔۔ میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو ہیٹ چلا اب چٹا کو بھی

رد۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت و قوت ملی دے یہاں خدا سے

جی تو حق بات نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشا ہی بن گیا ہوں۔ - رنج

ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے جو کہ مجھے پہنچتا ہے کرتا

ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور نقارسی دان ہوں۔

آن دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے سچ تو کیا ہے

غالب کیا مرا، بڑا اطمینان، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعلیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جست

آرام گاہ..... مرثیہیں "اللب رہے ہیں چوں کہ یہ اپنے کو شاہ قلم و خن جانتا تھا" "ستر مہر"

اور ”بادیہ زاد“ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔۔۔ ان سے پچھڑ رہا ہوں ابھی حضرت نواب

[illegible]

5. 10. 1941

مجلسه اول در تاریخ ۱۳۰۲/۱۰/۱۵

ہوں نہ لکھو۔ - جتنے جاتا ہوں اُنہی کے جاتا ہوں بدل بدل کھاتا ہوں اب کہ اگر دیکھتے

جاتا ہوں۔ حسبِ مروت آئے کی مراد ہوں کہ۔ نہ کفر ہے نہ طاقت ہے نہ کراہ ہے نہ کجی

10

”کیوں صاحبِ روزِ عی و ہر کے پاکی سنوے گی اور اگر کسی طرح نہیں بنتی تو

رو بخنے کی وجہ تو گھسور۔ میں اس تنہائی میں صرف انگوٹوں کے بھر سے بچتا ہوں یعنی جس کا خط آتا

میں نے جانتا کہ وہ شخص تحریف الایہ۔ خدا کا احسان ہے کہ کی دن ایسا نہیں ہوتا جو اس طرف

جوانب سے مدد چاہنا آ رہے ہوں بلکہ ایسا بھی دن دن ہوتا ہے کہ دودھ پڑا ایک کلاں کا روڈ

۱۱۷) ایک دسح کو ایک دسٹام کو۔ میری دل گلی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑنے اور

جواب لکھتے ہیں گزر رہا ہے یہ کیا سبب؟ دس دن بار بار درن سے کھارنا خط نہیں آیا

یعنی تم نہیں آئے۔ ڈاکھو صاحب، نہ کلینے کی وجہ لکھو آ رہا آئے جس کلن نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو

2

نواب امین الدین احمد خان کو لکھتے ہیں:

”۔۔۔۔۔ بھائی تمھارا باپ بدگمان ہے۔ یعنی محمد کو زندہ سمجھتا ہے۔۔۔ محمد اسلام بھرا اور ہے۔

شعر میں انہیں کہنا کہ --- مجھے کاغذ و کفن کی فکر نہ رہی ہے۔ وہ تمام کمر شعر و سخن کا طالب ہے۔

زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا؟ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوا لو اور تم اس زمین میں چند شعر لکھو

...

”صاحب وہ زمانہ نہیں ابھر تھا اداں سے قرض الیا ابھر درباری مل کو مار

۱۔ حضرت سیدنا ابوبکرؓ کو بھی حالوں ملی۔ ہر ایک کے پاس قمیص مہری موجود تھا۔ لگاؤ۔ چالو

”۔۔۔ اب اور کیا لکھوں۔ تمہارا داغ چل گیا ہے۔ لٹاؤ گے کو کرید کرید مسودے

کو بار بار دیکھا کر دیا کے کیا؟

بحرِ کوئی ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

”۔۔۔ لوسیاں سید زادہ آزادہ۔ دلی کے عاشق و لدا دہ ڈہے ہوئے اردو بازار کے

رہنے والے، حسد سے کھنکھوڑا کہنے والے۔ ندول میں مہر و آرزوم، نہ آکھ میں حیا و شرم“

مرزا غالب کے خطوط میں برجستہ محفلے ایک دو نہیں ہزار ہا ہیں ان سے غالب کی

شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

سید صاحب کو لکھتے ہیں:

(”نہ تم مجرم نہ میں گناہ گار تم مجبور میں ناچار لو اب کہانی سنو میری سرگزشت میری

زبانی سنو۔“)

”خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا

ہے ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سر مایا آرائش گفتار بہم پہنچایا

ہے۔“

”نارڈالا یا ریتیری جواب ملی نے۔ اس چرخ کی رفتار کا برابر ہو، تم نے اس کا کیا گناہ ڈرا

تھا۔ ملک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے ایک گوشہ و تشہ تھا چند مفلس، بے نو ایک جگہ

فرام کو کرئیں بول لیتے تھے۔۔۔ ابھی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہے جاؤ اپنے گھر۔ میں تو

روٹی کھانے جاتا ہوں اندر باہر سب روزے دار ہیں یہاں تک بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی،

صرف ایک میں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خواہ ہیں“ برجستگی ملاحظہ ہو،

میر مہدی صاحب صحیح کا وقت ہے جاؤا خوب پڑ رہا ہے۔ انگلیٹھی سامنے رکھی ہے، دو حرف

لکھتا ہوں ہاتھ پاتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی بھی، مگر ہائے آتش سیال کہاں کہ جب دو

جرعے پی لئے فوراً رگ دیپے میں دوڑ گئی دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا نفس ناطق کو توجہ

بہم پہنچا۔ ساتی کو شرمندہ اور تشنہ لب ابائے غضب ابائے غضب۔“

”میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو، ادھر آؤ خیر میں سنو“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

صاحبِ نواب صاحب کیسے، اوقاتِ صائب اب سبھو تو اور فراموشیابی یہ کیا ہے جرتی ہو رہی

ہے؟ کچھ تو اسکو، کچھ تو بولو“ بولے کیا ہے حیا ہے غیرت کوئی سے شراب گندھی سے گلاب،

ہزار سے کپڑا میزہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لے جاتا تھا یہی سوچا ہوتا کہاں

سے دوں گا۔“

غالب کے خطوط کی ایک اور بڑی خوبی خوشی تحریر ہے۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں

بات کرتے ہیں برجستہ سوال جواب کرتے ہیں خود ہیٹے ہیں دوسروں کو ہنساتے ہیں ان کے

طنز میں گہرائی ہے لیکن وہ کسی کا دل دکھانے والی بات نہیں کرتے۔ ان کا رویہ اگر کہیں

مراجم ہے تو بھی اس میں کسی کی تعجیب کا پہلو نہیں نکلتا اگر زیادہ غصہ آتا ہے تو اپنی ہی

خاسیاں گنوانے لگتے ہیں لیکن ان کے ہاں قلعہ کی ہے، خوشی ہے، تاریخی پر داز ہے،

خوبصورت الفاظ ہیں اور پھر ان کی پیشکش اس انداز کی ہے جیسے وہ زندگی کو خوش گوار انداز

میں گزارنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے ہاں عزت اور شرافت کا ایک معیار ہے، بھکدین

کہیں نہیں ہے معاشی طور پر بھی وہ کبھی کرکرت بات نہیں کرتے۔ جو معیار زندگی ان کا ہے وہ

اس پر قائم رہتے ہیں وہ کچھ بھی لکھتے تھے بے تکلف لکھتے تھے، الفاظ کے انتخاب یا مطالب

کی تلاش و جستجو میں وہ کبھی نہیں پھٹکے۔ مطالب و کش الفاظ کا لباس پہن کر اس طرح بنے چلے آ

رہے ہیں جس طرح نوارے کا منہ کھل جانے سے پانی خود بخود اچھلا چلا آتا ہے۔ ان کے

خطوط میں بھی آم ہے، بے تکلفی اور بے سانسگی کے لئے کچھ شائیں ملاحظہ ہوں۔

مرزا قاسم نے خط کے جواب میں تاخیر کی تو ان کو لکھا:

”کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے

خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زہار کوئی خط

سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے۔“

”خیر و شرمندہ بارہ بیچے تھے میں نکلا پلنگ پر لیٹا ہوا حنفی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر

خط دیا میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو اکھکھایا کرتا گلے میں نہ تھا میں گریبان چھانڈا اتنا حضرت

کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا۔“

میر مہدی بحرِ کوئی کو لکھتے ہیں:

”ریتہ لنگھوں نے میر کی بہار دکھائی، بہ سار کی ریل روانہ ہونے کی ہر دہل میں آئی۔ پاؤں سے اپاچ کاؤں سے بہرا، ضعف بھارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ۔ ان سب نسخوں پر ضعف طالع۔ کیوں کر قصد سفر کروں؟ جن چار چاند روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟“

ایک اور خط میں رام پور سے لکھتے ہیں:

”میں حسبِ اطلب نواب صاحب کے درمیان آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان

کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب دستجو اور عرضی ادا سلا ماہ جنوری ۱۸۶۰ء میں ولاہیت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جہاں پہنچتا ہے یقین ہے کہ

پارسل ولاہیت پہنچ گیا ہوگا۔“

ایک دو جگہ نہیں بابا انھوں نے دہلی کی عام حالت کے حوالے سے، اگر بڑوں کے

ظلم و ستم کے حوالے سے، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے جستہ جستہ لکھا ہے کہیں کہیں تو وہ جذباتی بھی ہو گئے ہیں یہ وہ دور تھا جب ذرا سی بات پر زبان گھنچ لی جاتی تھی۔ کالے

پانی کی سزا عام تھی۔

غالب کے یہ خطوط عام خطوط اس لئے بھی نہیں ہیں کہ غالب نے انھیں قطعی نگی اور ضرورت کے تحت نہیں لکھا۔ ان کا مقصد اپنے ذاتی حالات اپنے مکتوب الیہ تک پہنچانا تو تھا لیکن ان کے اکثر و بیشتر خطوط ایسے لوگوں کے نام تھے جو علمی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے قہر دان تھے۔ ان سے فیس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی مدد کرنے میں خرمحس کرتے تھے۔ وہ ان کے ہمدرد، دردمند اور ستر تھے اس لئے بھی ان خطوط کی نوعیت مختلف ہے۔

غالب شاعر تھے ان کی ہر بات میں شاعرانہ رنگ تھا وہ اپنی بات کی جزئیات پیش کرنے پر بھی قادر تھے ان کے اسلوب کے پیش نظر ان کی جزئیات میں بھی لطف ہے اس سے ان کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے اور ان کے مشاہدے کا بھی احساس ہوتا ہے ایک سفر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”دو تین گھنٹہ کی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھو سے رہوں وہاں قافلوں کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپو کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار باہر علی اور حسین علی،

ہوتے ہیں لیکن یہ ان کی دلی کیفیت کے ترجمان ہوتے ہیں جتنا وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے خاندان کی کیفیت کیا تھی؟ وہاں مکس معاشر کیا تھے؟ وہ کہ کن کن مکاتوں میں رہے۔ وہاں انھیں ذاتی طور پر کیا کیا تکالیف تھیں یا آرام تھے۔ لوگوں سے ان کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ کہا نے پہنچے اور دوسری معاشرتی باتوں کے بارے میں اچھی خاصی تفصیل کا علم ان خطوط سے ہوا ہے ممکن ہے وہ اگر اپنے بارے میں مضمون لکھتے تو اتنی باریک بینی سے ہرگز کام نہ لیتے صرف مولیٰ مولیٰ باتیں ہی بیان کرتے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے ہر پہلو پر کھل کر بات کی ہے۔ رات دن کی مشغولیات کا حال۔ کن کن بیاریوں سے سابقہ پڑا؟ آخری عمر میں ضعف کس رفتار سے ترقی کرتا گیا۔ اپنے شاگردوں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے نیز یہ بھی لکھا ہے کہ حفظ و مراتب کا وہ کتنا خیال رکھتے ہیں کن کن لوگوں سے ان کے کس قسم کے تعلقات تھے۔ نظم و سنہر کی اصلاح کا کیا طریقہ تھا۔ اخلاق کیسے تھے انھوں نے کہاں کہاں کے سفر کئے اور ان سفروں میں انھیں کیا کیا تکالیف پیش آئیں۔ اپنی معاشی زندگی کے بارے میں بار بار انھوں نے بھرپور انداز میں تذکرہ کیا ہے کیونکہ شاعری فعل نہیں تھا اس یوں ہی انسان اپنے دکھ سکھ دوستوں میں بیان کر دیتا ہے ہمیں بہت سی ان کی ذاتی باتوں کا علم ان خطوط سے ہی ہوتا ہے۔ انھوں نے غدر کے حالات جس انداز سے لکھے ہیں اس میں ان کی نجی زندگی اور ذاتیات کو دخل ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اگر بڑوں کی چالاکاکی اور مکاری سے نالاں تھے۔ ان خطوط کی روشنی میں عام کلی حالات کے متعلق بھی خاص معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے نتائج و عواقب پر بہت سے خطوط میں تفصیل لکھی ہے میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں:

”انھوں نے جنگ آزادی کی جگہ غدر کا ہی لفظ استعمال کیا ہے اس دوران لوٹ مار کا جو سلسلہ شروع ہوا اس سے پوری قوم پر اثر ہوا۔ غالب کے ذہن میں جنگ آزادی کا تصور کچھ دوسرے ہی انداز سے ہے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اگر بڑوں کو وہ کھل کر بُرا کہیں اور انقلابی کہلا نہیں اگر بڑوں کی عام روش سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ان کے ظلم و ستم کا شکار بھی رہے۔ (ج-ک)

گھوڑوں پر سوار چل دیے چار گھڑی دن رہے میں ہاپڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹپکتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھردن رہے قافلہ آیا۔ میں نے پھٹنا تک بھر گئی داغ کیا۔ دو شاہی کباب اس میں ڈال دیے رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھائے لڑکوں نے اوپر کی پھڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوا لیا۔ ترکاری نہ ڈلوائی چار پانچ کے محل میں ہاپڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے ہاپڑ گڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چار پائی بچھائی اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ ٹھٹھک رہا ہوں۔“

نواب امین الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

”یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمۃ، (نہ ماند آب جز چشم در یتیم) شب و روز آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے نہ رات کو تارے۔ زمین سے اٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی، ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے وہ اور بھی جاں گزا ہے۔“

عذر کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ قید سے رہا ہوئے مرزا مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

”میں یہ مجروح استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا چار دن وہاں رہا پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر بیٹھے کو گیا، مشکل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔۔۔ میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھاجھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔“

کہیں کہیں ان خطوط میں منظر کشی بھی کمال کی ہے ان کی طبیعت میں ڈرامائی عنصر تو ہے ہی جب وہ منظر کشی کرتے ہیں تو ان کے جوہر اور بھی نکلتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں۔

تمہارا علیہ کچھ کر گھارے کچھ وقامت ہونے پر مجھ کو رکھ نہ آیا، کس واسطے کہ نہ را قد بھی در رازی میں آگشت نما ہے۔ تمہارے گندی رنگ پر رکھ نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں بیٹھا تھا تو ہیرا رنگ چمکی تھا اور دیکھ در لوک اس کی مثال کیا کرتے تھے۔ اب جو بھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر ساپ سا چمچ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رکھ نہ آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی نکلی ہوئی ہے۔ وہ حرمے یاد آ گئے کیا کہوں گی پر کیا گزری۔۔۔ جب داڑھی مونچھ میں ہال سفید آ گئے۔ تیسرے دن جینئی کے اندے گاؤں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مٹی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھلیارہ، جولاہا، کنجرا منہ پر داڑھی سر پر ہال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔۔۔“

کچھ مثالیں اور بھی ملاحظہ ہوں ان سے غالب کی منظر نگاری کا اندازہ ہوگا مجروح کو لکھتے ہیں ”برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹہرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف والاں کا جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کو بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیس چھپائی ہو گئی ہیں۔ گھڑی بھر سے تو چھت گھنٹہ بھر سے۔ غالب کرائے کے جس مکان میں رہتے تھے مالک مکان نے فروخت کر دیا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

”جس نے لیا اس نے مجھے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بیدر نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاڑ بندھ گئی رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گلان یہ گز رتا تھا کہ یہ نکلر ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی۔“

میر مہدی مجروح کے نام

”برسات کا نام آ گیا سو پہلے تو مجھلا سنو۔ ایک عذر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت و باکی، ایک مصیبت کل کی۔ اب یہ برسات جمع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی

نہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ جدا اور جدا ہو چکا تھا، ایک ایک قسم سے جس میں تھا۔ ہے۔ اور جو علی شہد تھی
 قصیدوں کے تحمل ہوئے بغیر نہ کھیل سکے۔ جس کی مدح میں جس قسم سے کہے گئے وہ
 عوام سے گئی ہے۔ پہنچا۔ صاحب زبانی خدا کی دشمنی میں داخلہ لے کر ان کو کھینچا رہا تھا۔

”وصفوں کا۔“

خرافت کے نئے نئے ڈھنگ نئے نئے گوتے ملا دھکے۔

”اور لوگ روٹی کھاتے ہیں میں پیر اکھاتا ہوں“ (مراد یہ کہ ناداری سے پہلے

ہیچے پڑے)

رام پور کے ایک سرکاری جشن کا حال لکھتے ہیں:

”طوائف کا وہ ہجوم، دکھام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاہیے“ ایک

اور خط میں لکھتے ہیں:

”جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو زری

انگلی بھی پڑ رہا ہے بوتل گاہں موقوف۔“

کشم غلام خف خاں کو لکھتے ہیں:

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔

ٹکا لائیں گیا، ادا نہیں کسی محلے میں اب تک پایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آنکھ

دیکھنے کیا ہوتا ہے۔“

تفصیل حسین خاں کو کس انداز سے مخاطب کرتے ہیں۔

کیوں صاحب!

یہ پتچا سمجھتا ہونا اور شاد گردی و اسادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پارہ کی چیز

ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جائے تم کیا فقیر ڈھاتے۔ میرا کلام، خرید آٹھ دس روپے

کی سودہ بھی میں نے نہیں کہا کہ مجھ کو دے ڈاؤ تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعدا دود۔ اگر

تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حاصل رقعہ کو دود تو تم کو

آفرین“ سیاح کو لکھتے ہیں۔

دہلیان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص نا آشنا، موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان رنگا

چمک جاتی ہے رات کو کبھی کبھی اگر تار سے، کھائی، بچے ہیں تو لوگ ان کو بکھو مجھ جیسے ہیں
 مہاراجہ نہ بکھن۔ ہزار بار مکان گر گئے، بنگلوں آدمی باہر اب کر مر گئے کئی کئی آدمی بہرہ
 ہے۔ قصہ مختصر وہ، ”ان کاں“ تھا کہ پینڈہ برساتا جا نہ پیدا ہوا یہ ”پن کاں“ ہے کہ پانی ایسا
 برساتا پڑے ہوئے دانے بہہ گئے، جنھوں نے نہیں بویا تھا وہ بونے سے رو گئے سائن لیاری
 کا حال۔“

غالب کے خطوط کی ایک خوبی شوقی قریب ہے ان کی اس کو خوب الطائف حسین سالی

ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بتاتے ہیں۔ مکتوب الیہ کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط

میں شوقیاں کرتے ہیں۔

مکتوب الیہ کی لڑکی چھوٹی تھی جب غالب نے اسے دیکھا تھا اب وہ بڑی ہو گئی تو

غالب لکھتے ہیں۔

”کیوں بچی اب ہم اگر کول آئے بچی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک

میں سمجھتیاں پچا سے پردہ کرتی ہیں“ نواب امیر الدین احمد خاں رٹش لوہار کو لکھتے ہیں۔

اے مرد چشم جہاں تین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں تین غالب

کی پٹلی، چشم جہاں تین تمھارا باپ مرزا اعلا الدین احمد خاں اور پٹلی تم۔ میاں تمھارے دادا

تو نواب امین الدین احمد خاں بہادر ہیں میں تو صرف تمھارا داماد ہوں۔

ظرافت سے حسن طلب کا کام لیتے ہیں نواب رام پور کو لکھتے ہیں:

”قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا

پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے۔“

نواب علاؤ الدین احمد خاں ان کے لڑکے کی ولادت اور تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

”شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھاتا ہے طریق صید انسانی کھاتا ہے جب جو ان ہو

جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم خونخوار ہو گئے حسن طبع خدا داد رکھتے ہو، ولادت فرزند

کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو، کہ مجھ کو بغیر زم زدہ دل مردہ کو تکلیف دد۔

علاؤ الدین احمد خاں تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ

لڑکا نہ بنیا۔ مجھ کو اس دہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے محسوس طالع کی تائید تھی۔ میرا احمد ج جیتا

کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اپنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیت کی طرح نہ دھوا رہو۔ ہائے اتنے پارہ مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔۔۔۔۔“

لکھنؤ کی تباہی کی طرف بھی اشارے کئے ہیں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

”ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلا کچھ نہیں کھلا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ یہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگئی ہوگی۔ امید دار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر محمول نہ رہے۔ پاسکین مبارک کا تشہیر ہی بازار سے زیادہ نہیں معلوم۔ ظاہر اسی قدر کافی ہوگا ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔۔۔۔۔“

غالب کے خطوط میں اجتماعی شعور کا اظہار ملتا ہے انھوں نے ذاتی سطح پر حالات کو دیکھنے کی کوشش کی وہاں اس وقتی ردِ عمل کا بھی اظہار کیا ہے جس کا تعلق خارجی ماحول سے تھا۔ ان کی معاملہ نشینی اور دور اندیشی نے انھیں آنے والے واقعات سے باخبر رکھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

”صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تمام دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں ہر وجہ تدریج آئے شعر کہے۔“

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھتے ہیں:

”آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ورنہ قصہ مختصر تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں“

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

”۔۔۔۔۔“

نے جو کچھ لکھا تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں، کچھ قابل لکھنے کے ہے تم تم جیتے ہیں زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔

اگر عزیزوں کی عمل داری افسروں کی ہے پر وہائی پرکتہ چینی کرتے ہیں۔

اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں بنو داؤد پتہ کچھ کچھ آباؤ بونگے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر ممکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں

مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیا رہ رہا ہوں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ زبیر سنگھ بہادر والی پٹیلہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ کر بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیر دار، پٹن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گداز میں مبتلا ہیں۔ گردہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہ اس کو نوکر کی سمجھو، خواہی مزدوری جانو اس فتنہ آتش میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا خبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا اطمینان نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے ہوئے کپڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ بحرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔“

تفتہ کو ہی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

”کیونکہ نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، جو کچھ مجھ کو ہے

اس کا بیان تم کو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اگر مزید قوم میں سے جو ان رو سیادہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی شہیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی پارہ دار کوئی میرا شاگرد، ہندوستان میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد،

وہ بارشوں کو پسند تو کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں تالاں بھی نظر آتے ہیں محض چھتوں کے چکنے کی وجہ سے، نفاس کا انھیں بے حد خیال ہے۔ اپنی غذا کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی شراب کا حساب رکھتے ہیں اور کوئی بات ایسی نہیں ہونے دیتے جو ان کے رکھ رکھاؤ میں فرق ڈالے یا پروفیسری کے لئے گئے جو طریقہ کار نوکری کے لئے ہوتا ہے وہ اپناتے تو شاید نوکری رکھ لئے جاتے پر پہل ان کی پیشوائی کے لئے نہیں آیا تو وہ اُلے واپس آ گئے۔ انھیں ایسی نوکری پسند نہ ہوئی جس میں ان کی رہی سہی عزت بھی داؤ پر لگ جائے۔ اسی طرح وہ اپنے عقیدے پر کوئی مصلحت پسند نہیں کرتے بڑے صاف گو اور نڈر ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

حکیم سید احمد حسن مودودی کو اپنی ضعفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

”آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ ریشہ پیدا ہو گیا۔ بیٹائی میں بڑا فزور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لینے لینے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوچے، نہ بات سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں شاہ شرف علی بولندر کو بسبب کبر سن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا زیادہ حد آداب۔“

”نا توانی زور پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، کابلی، سستی گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز پیش ہے زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر تا پر سیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو ستر مقرر ہے اور ہادیہ زادیہ ہے“

غالب کا لطیف انداز ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے وہ مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے یہ خصوصیت ان کے خطوط میں نمایاں ہے ان میں جگہ جگہ تخیل کی بڑی بلند پروازی نظر آتی ہے اور تخیل کی اس بلند پروازیوں کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں ایسے خطوط میں ان کے ہاں بڑا شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

”مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں ۵ برس کی عمر ہے ۵ برس عالم رنگ و بوی کی عمر کی ابتداءے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیچ، کھانا مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی کبھی بنو، شہد کی کبھی نہ بنو، سو میرا اسی نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی احمک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجالاؤ۔ غم نہ کھاؤ۔ اگر ایسے ہی اپنی گرفتار سے خوش ہو تو چنا چنان نہ سہی مناجان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جادوئی ہے اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگی گانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ ایک حور اجیرن ہو جائے گی۔ وہی زمر دیں کاخ اور وہی طوبی کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔“

غالب کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا ان میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ان کے عزیز اور قربت دار تھے۔ کچھ جاگیردار تھے۔ کچھ پنشن دار تھے، کچھ شاگرد تھے، کچھ علمی ادبی شخصیات تھیں۔ ظاہر ہے ہر ایک سے ان کے تعلقات مختلف قسم کے تھے اس لئے ان سے گفتگو بھی اسی معیار یا انداز کی ہوتی تھی۔ غالب حفظ و مراتب کا خاص خیال رکھتے تھے اور تعلق کی نوعیت سے مخاطب ہوتے تھے انھیں اپنی ناقدری کا احساس تو تھا لیکن وہ کہیں بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ خوش رہنا چاہتے تھے، شکایت کرنا جانتے تھے لیکن مایوس ہونا اور اپنی ناقدری کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناتے تھے جو جی میں آتا کہہ دیتے تھے۔

غالب کے ہاں کبھی کبھی ان کے انداز بیان میں تخیل کی پرواز کی وجہ سے تمثیل نگاری کی بھی خصوصیت پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ زندگی کے شعور اور حقائق پر نظر رکھتے تھے اسی لئے ان کی تحریر میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے ان کی باتوں میں فلسفیانہ رنگ نظر آتا ہے ان کے ہاں ایک رچی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے ان کے جملے رنگینی اور رعنائی کے باعث بڑا اثر رکھتے ہیں ان کے ہاں فطری روانی نظر آتی ہے ایک فطری بہاؤ کا احساس ہوتا ہے نفسی اور رعنائی کیفیت ملتی ہے اسی طرح ان کے اسلوب میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے اپنی علمی بصیرت کے

بار سے میں چودھری مہدالغور کو لکھتے ہیں:

”چودھری صاحب شفیق کرم کی خدمت میں بعد از سال سلام مستون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی۔ ورنہ میں سزاوارست کش نہیں ہوں، ایک سپاہی زادہ بچہ اداں اور پھر دل افسردہ روح کا کاروان فرسودہ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شعر حسین لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزہ سروش ہیں اور ان کا کلام دتی ہے یا اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے۔ مگر یہ بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔“

ایک خط میں تفتہ کو اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

”آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں۔ اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں۔ اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھانٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قہیدے دیکھو، تشبیہ کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاتقلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، موجب فرمائش جان جا کو ب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا جتنی تمھاری مدح کی ہے ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کے عیوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں۔ ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آ جاتے ہیں۔ وہ صاحب تو پیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قلیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ

نظم و نثر کی خوبی کیا پہچانیں گے۔“

غالب نے اپنی تصانیف کی مکمل تفصیل تو کسی ایک خط میں نہیں لکھی ہاں جتنے جتنے مختلف لوگوں کو ضرور لکھا۔ دراصل وہ جس طرح چاہتے تھے ساری تصانیف اس طرح نہ چھپ سکی تھیں اس دور میں کتاب کی اشاعت کا زیادہ بہت انتظام بھی نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں اس سلسلے میں خاصی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے ایک خط میں خشی شیونرائن آرام کو لکھتے ہیں:

”صاحب، تم جواب نہ بھیجے سے گھبرا رہے ہو گے۔ حال یہ ہے کہ قلم بتانے میں میرا ہاتھ اگلوٹے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور درم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی۔ بہر حال اب اچھا ہوں بیچ آجنگ تم نے مول لے لی۔ اچھا کیا دو چھاپے ہیں ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک فشی نورالدین کے چھاپے خانے کا۔ پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔ کیا کہوں تم سے۔ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے نسی بھائی اور میرے شاگرد رشید بھی ہیں جو نظم و نثر میں میں نے کچھ لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون بچپن جزو اور بیچ آجنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سو اور جزو مطلق اور مذہب اور انگریزی ابرے کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپیہ کے صرف میں بنوا لیں میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے پھر ایک شاہزادے نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ قہنہ برپا ہوا اور شہر لئے اور دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان لیٹھا ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات قلمی ہندی کا کلیات قلمی بیچ آجنگ قلمی مہر نیم روز اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکٹا ہوا آوے تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔ جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اردو نثر کی۔ وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں مگر بھائی تم غور کرو اور دو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور عبارت میں معافی نازک کیوں کر بھروں گا۔ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں کون سی بات کون سی کہانی کون سا مضمون تحریر اور کیا تدبیر کروں۔ تمھاری

عزیزوں کے برابر نہیں جانتا۔۔۔ جب تصور کرتا ہوں کچھ بکھرے ہوئے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ دتار ہے۔ حقیقی میر ابھائی دیوانہ سرگیا اس کی بیٹی اس کے چار بچے اس کی ماں یعنی میری بھالہ جے پور میں پڑے ہوئے ہیں اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا یعنی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے یہاں انھیں اور امرا کے ازود و احوال دلا دلا گئے پھر یہیں اور میں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو کچھ چاہیے۔۔۔ ہمیشہ ایک فکر برابر جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں۔ بھوت نہیں ان انجور کا تحمل کیوں کر کروں۔ بڑھاپا، ضعف قوی، اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے شاید دو چار گھنٹی بیٹھا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں، گویا صاحب فرماں ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقد رطافت بنائے رکھتا تھا اب میر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گرفت کا ہنگامہ ہے دربار میں جاتا تھا خلعت و خاثرہ پا تھا وہ صورت اب نظر نہیں آتی نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں۔ نہ بے گناہ ہوں نہ گناہ گار ہوں نہ مجر نہ مسند بھلا اب تم ہی کہو کہ اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاتا تو نہ کہاں سے لاؤں۔۔۔

آخری عمر کے خطوط میں کلف، افسوس، جوانی کی یادیں اور اپنی معذوری کا ذکر ہے اخراجات زیادہ تھے آمدن محدود اور پھر مسلسل بیماری نے انھیں خاصا افسردہ و مایوس کر دیا تھا۔ چودھری محمد الغفور سرور کو لکھتے ہیں:

”۔۔۔ مہینے بھر سے صاحب فرماں ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر اڑتا ہوں۔

کل سرائے اگر چہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے پر کیا امکان جو جاسکوں۔ صبح کو نو بجے کھانا نہیں آتا ہے پلنگ سے کھس پڑا ہوتا ہوں دھوکھانا کھانا پھر ہاتھ دھوئے کل کی پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجی لگی رہتی ہے اٹھا اور حاجی میں پیشاب کیا اور پڑا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد بعد آتا ہے اس صاحب فرماں ہونے کو دیکھو اور دم بدم تقاضے بول کو دیکھو۔ پانچاٹھ اگر چہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو۔ ایک پھوڑا دایمیں پینچے میں جس کو سادہ کہتے ہیں۔ دو پھوڑے بائیں پینچے میں یہ سہل ہیں۔ بائیں پانوں میں کلف پادبشت پائے لے کر آدھی پندلی تک درم اور درم بھی سخت ردا و علت

رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔ ایک قریب سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گرفت سرور و دستہ کی خریداری کرے گی اور ان شخصوں کو ولایت بھیجے گی کیا امید ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ میں تمھارے پاس اللہ آباد سے حکم پہنچے۔۔۔

غالب کی عمر جب زیادہ ہوئی اور وہ بیمار بننے لگے تو ان کے روزمرہ میں فرق آ گیا لیکن خط کا جواب دینے میں وہ اب بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اس عمر میں جو خطوط لکھے گئے ان میں ان کی بیماری، نشاہست اور معذوری کا ذکر نمایاں ہے مگر اقلتہ کو لکھتے ہیں:

”آؤ سرزراقلتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو سامعہ مر گیا تھا اب

باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ چنتی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں حواس سراسر متزلزل ہیں حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سرور پے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے آپ میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ خوش خدمت سابقہ میں شمار کیجئے تو میں بسک لبر سہی۔ ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ شرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرر کی نو بریک آئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہ جو انوردی دیئے جاتے ہیں اور بھائی تمھاری مشین چشم بدور صاف ہو گئی۔ رطب و یاتس تمھارے کلام میں نہیں رہا، اگر خدای نہ خواہی تمھاری عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے۔ چراغ دم صبح و آفتاب سرکہ ہوں انا للہ وانا الیہ راجعون“ اس طرح کا اپنی معذوری کا ایک خط مرزا یوسف کے نام ہے، لکھتے ہیں:

”یوسف مرزا میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودا ہوا جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس جو غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آ گیا ہو تو عجب ہے بلکہ اس کا بار نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کیا غم ہے۔ غم مرگ غم فراق غم رزق غم مرگ، قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر گوتتا ہوں مظفر اللہ مرزا ناصر الدین مرزا عاشوریک میرا بھانجا اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ مصطفیٰ خان ابن اعظم اللہ ولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے

”خطوات ہے کچھ نہ ہو اب تجوہ ہے کہ نیم کا بھرتا ہاندھے جب کے چھوٹے تب مرہم لگایے
کیونکہ کف پائیں جراثیم کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا۔“
اسی طرح قاضی عبدالجلیل کو لکھتے ہیں:

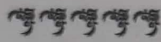
”۔۔۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ۔ ضعف کیوں کرتے ہو۔ برس دن
صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے
پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کہاں جواب پھر تو لید دم صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں۔“
غالب کی شخصیت میں ایک اجتہادی شان نظر آتی ہے انھوں نے اردو شاعری کو ایک
نئے انداز سے آشنا کیا بلکہ اردو نثر کو بھی ایک نیا اسلوب دیا اس اعتبار سے وہ ہماری نظم و نثر
دونوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہ خطوط اردو نثر کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔
ان کی بے تکلفی، روانی، بے ساختگی، اسلوب اور طرز ادا، خیال انگیزی، خیال آفرینی، ان
کی شخصیت کا پرتو، مزاج کا ہر انداز ان خطوط سے نمایاں ہے۔ وہ جنگ آزادی کے اثرات
سے بہت متاثر تھے۔ ان خطوط میں ان کی دلی کیفیت بر ملا موجود ہے۔ انھوں نے اپنے
سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی، تمدنی اور ثقافتی ماحول کو اپنے خطوط کا ایک اہم حصہ بنایا ہے۔
تہذیبی انقلاب کا پس منظر خاصا نمایاں ہے یہ اچھوتے اور انوکھے خطوط جو جذبے کی
گہرائیوں سے لکھے گئے ہیں۔ عام معلومات کے ساتھ تعلقات کے علاوہ قلبی واردات کے
نمونے بھی موجود ہیں۔

جب ہم ان خطوط پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جنگ آزادی ان کے سامنے
لڑی گئی۔ انگریز جیسی ظالم، جابر اور فریبی قوم جس کے پاس حکومت کے علاوہ ہر طرح کے
اختیارات بھی تھے پولیس تھی، فوج تھی، جدید اسلحہ تھا اور زرخیز غلام منجر کی صورت میں موجود
تھے، اُن سے ٹکرانا اور وہ بھی ایک بے منظم قوم کے لئے بے سروسامانی کی حالت میں ایک
ایسا مرحلہ تھا جس پر تاریخ نے گہری روشنی ڈالی ہے۔ سارا نظام درہم برہم ہو گیا ایک اور ہی
نوعیت کا انقلاب تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت عام تھا۔ غالب اس زمانے میں اپنے مکان میں
ہی مقید رہے اور وہ کیونکر محفوظ رہے اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک خط میں کیا بھی ہے لیکن
یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب کو اس ابتلا کے زمانے میں بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ان

کے حقیقی بھائی یوسف مرزا اس زمانے میں دہلی کی گلی کے عالم میں سرے۔ ان ساری باتوں کا
تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب ”دستخط“ میں کیا ہے وہ ایک تاریخی حیثیت ہے جب کہ یہی
واقعات انھوں نے خطوط میں الگ الگ لوگوں کو لکھے تو ان کے دلی جذبات اور کیفیات کے
غماز بن گئے۔ غالب ساری زندگی ایک کہانی بنے رہے۔ زندگی اُن کا ساتھ نہ دے سکی۔
لیکن انھوں نے زندگی کا ہیضہ ساتھ دیا، وہ اس زندگی کے حالات سے خوش نہیں تھے لیکن سر
کرنا جانتے تھے انھوں نے زندگی اور اس کے بدلنے ہوئے حالات سے بڑی حد تک
مطابقت پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ان حالات کو سمجھا بھی ہے اور انھیں سمجھ کر برتا بھی
ہے وہ زندگی کے گہرے باطن تھے اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑتی تھی اور
وہ اس میں سے نئے پہلو نکال لیتے تھے۔

اُن کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت پسندی بھی شامل تھی کسی چیز کا نہ ہوتا
انھیں اداس اور ٹمگین ضرور کرتا ہے لیکن وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے تھک کر نہیں بیٹھ
جاتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے شاید یہی ان کی زندگی کا
انقلابی پہلو بھی ہے۔

یہ خطوط ان کی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے میں ہماری خاص رہنمائی کرتے
ہیں۔ ان خطوط سے غالب کی وہ صورتیں بھی سامنے آگئی ہیں جن کا اظہار ان کی شاعری میں
مشکل سے ہی ملے گا۔



ڈاکٹر امت الحمید کوثر

سر سید احمد خاں: زبان و ادب

سر سید جن حالات اور ماحول میں پروان چڑھے اور جس زمانہ اور جس مقام میں انشود نما پائی وہاں علمی فضا کا دور دورہ تھا۔ دنی بڑے بڑے پاکستانوں کا گڑھ تھی۔ سر سید کو مفتی صدر الدین آزر دو، مرزا غالب اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے اہل علم و ادب بزرگوں اور اساتذہ فن کی صحبت نصیب ہوئی۔ ابتدائی سے ان کو تالیف و تصنیف کا کاموں سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا جس قدر دل تصنیف و تالیف میں لگتا ہے کسی اور کام میں نہیں لگتا انھیں شروع ہی سے اردو زبان سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور قلبی تعلق تھا۔ ان کا لسانی شعور بھی دہلی کی فضا کا پروردہ تھا۔ دہلی میں اردو کی ترقی کے امکانات روشن تھے۔ اردو اپنی سادگی اور فطری ہم آہنگی کی وجہ سے عمومی مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن خواص اس سے بچا گئی کا رتا کر رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کے ذریعے سلیس اردو نثر نگاری کو رواج دیا لیکن اردو، ہندی کے الگ الگ شعبے بنا کر اردو شعبہ کے لئے مسلمان فشی اور ہندی کے لئے ہندو پنڈت کا تقرر لسانی تفریق کا وہ نقطہ آغاز ہے جس نے بعد میں سیاسی صورت اختیار کر کے نہ صرف لسانی لحاظ سے بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی علیحدگی کے دو قومی نظریے کو جنم دیا۔ ہندوستان جیسے سرسبز و شاداب خطہ پر قبضہ کرنے کے لئے برطانوی مہروں کے یہ ابتدائی جھکاؤ تھے۔ برطانوی حکومت نے اس سچ کو چھپنے کے مواقع فراہم کئے جس نے آگے چل کر زبردست

سیاسی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے اثر سے ہندوستان میں نہ صرف سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ زندگی کے تمام شعبہ فکر کو انھوں نے متاثر کیا خاص طور پر ہندوؤں کو زندگی کے ہر شعبہ میں عروج و کامرانی حاصل کرنے کا سنہری موقع ملا لیکن مسلمان برطانوی حکومت کے منہ پر ظلم و استبداد کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کے اندھیروں میں بہک رہے تھے ان کی اسلامی تہذیب اور ان کے علوم و اثرات حکومت کی نظر میں کانٹے کی طرح دکھتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو کمزور اور بے بس کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی اردو بچوں کے مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی تھی اس لئے وہ بھی انگریزوں کی دست برد سے نہ بچ سکی۔

۱۸۶۷ء میں بنارس میں جدید ہندی کی تحریک کا ایک غلطہ بلند ہوا کہ سرکاری عدالتوں میں اردو زبان و فارسی رسم الخط کو موقوف کر کے بھاشا زبان کو جاری کیا جائے جس کا رسم الخط دیوناگری ہو۔ سر سید قوم و ملک کی بھلائی کی تمام کوششوں میں ہمیشہ ہندو مسلم دونوں کے مفاد کو یکساں اور یکجا مد نظر رکھتے تھے۔ وہ دونوں کو ایک آنکھ کی مانند سمجھتے تھے لیکن اس موقع پر انھیں یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان کا اتحاد کسی بھی معاملے میں ہونا ممکن نہیں۔ انھوں نے ایک انگریز دوست ٹیکسپیر سے ان خدشات کا اظہار فرمایا۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک مقصد کے لئے کسی صورت میں بھی مل کر کام نہیں کر سکتیں۔ گو اس وقت ان دونوں میں کھلم کھلا عداوت نہیں۔ لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے مستقبل میں لا تعداد پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی ہیں۔ بعد کے حالات و واقعات نے سر سید کی دور بین رائے اور ہوش مندانہ تجزیے کی تصدیق کر دی۔ ۱۸۶۷ء میں لسانی تنازعے کے نتیجے میں بہار میں ہندی جاری کی گئی اب ہندی کے حامیوں کی خواہش تھی کہ شمال مغربی صوبے میں بھی اس کا اجرا کیا جائے انھوں نے اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک مرکز الہ آباد میں قائم کیا۔ سر سید نے اسی سال اردو ذریعہ تعلیم کو مقبول عام بنانے کی تجویز پیش کی تھی اور اس نظر یہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ مغربی علوم و فنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے دہی زبان کی مدد سے آسان ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے۔ ان کا خیال تھا تعلیمی حصول میں یہ ذریعہ زیادہ سہل، آسان اور

مفید ہوگا۔ لیکن انھیں اس تجربے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے انھوں نے بعد میں اپنا نظریہ بدل دیا۔ ۱۸۶۸ء میں جدید ہندی کا مرکز بنارس میں قائم کیا گیا اس کے سیکرٹری سرودا پرشاد منڈل قرار پائے اس زمانے میں اخباروں میں بھی اس موضوع پر گرم گرم بحث جاری تھی کہ ہندی دیوناگری رسم خط کا نام ہے یا اس کو سنسکرت آمیز ہونا چاہیے۔ آخر کار ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کے حامل گروہ کی جیت ہوئی ان کا خیال تھا کہ ہندی سے عربی، فارسی الفاظ نکال دیئے جائیں، انھیں انگریزی حکام کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی بلکہ سرولیم جوز نے ہندی تہذیب کو ویدک سررشتوں سے جوڑنے کو مناسب قرار دیا۔ سردار پرشاد نے سرسید سے لسانی موضوع پر طویل خط و کتابت کی۔ سرسید اس زمانے میں انگلستان جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن لسانی موضوع کی قومی اہمیت کی بناء پر عدیم الفرستی کے باوجود انھوں نے سرودا پرشاد کے خط کا جواب دینا ضروری جانا۔ وہ زبان کے مسئلہ کی اہمیت و قدر و قیمت سے واقف تھے۔ انھوں نے اس خط و کتابت کے دوران زبان اور رسم الخط کے موضوعات پر روشنی ڈالی۔ ایک خط میں فرمایا ”آپ نے اس امر کی نسبت میری ناقص رائے طلب کی ہے کہ آیا ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے اضلاع شمال و مغرب کی عدالتوں میں رائج ہوئی مناسب ہے یا نہیں۔۔۔“ میری دانست میں اس طرح یہ بیان کرنا کہ ہندی زبان اضلاع شمال و مغرب کی موجودہ مخلوط زبان ہے جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے دو مخالف باتوں کو ملا دینا ہے اس لئے کہ زبان فی نفسہ اور چیز ہے اور کسی خاص قسم کے حروف میں اس کا لکھا جانا اور بات ہے میرے نزدیک اضلاع شمال و مغرب و صوبہ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان شائع ہونی چاہیے جس کو آپ ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں اس بات میں گفتگو کرنا کہ وہ دیوناگری یا فارسی یا انگریزی حروف میں لکھی جائے محض بے فائدہ بات ہے اس واسطے کہ خود عدالتوں کے کاروبار سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اس کو کس قسم کے حروف میں لکھنا مناسب ہے اور کون سے حرف ہمارے کام کے انجام کے لائق ہیں۔“

سرسید اردو اور ہندی دونوں کو ہندوستان کی زبان سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ جہاں زبان پر ہندوؤں کا اثر زیادہ ہے وہاں اس کو ہندی کہا جاتا ہے اور جہاں مسلمانوں کا زور ہے وہاں

اردو، دونوں کو ایک ہی زبان سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس نکتہ کی ایک اور خط میں یوں وضاحت فرمائی ”مگر جب آپ کہتے ہیں کہ ہندی زبان سے خاص ہندوستان کی زبان مراد ہے تو میں آپ سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا میں آپ کی صرف اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں کہ وہ زبان اور اردو زبان ایک نہیں ہے۔ اس واسطے کہ آپ اپنی پہلی جہمی میں یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ ہندی زبان سے مراد اضلاع شمال و مغرب کی موجودہ مخلوط زبان ہے۔ بس یہ مخلوط زبان سوائے اردو کے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ جب آپ کے نزدیک ہندی زبان ان اضلاع کی موجودہ مخلوط زبان میں امتیاز نہیں ہے تو پھر تہذیبی کے کیا معنی؟ اور ایک زبان کی بجائے دوسری زبان کیسے رائج ہوگی۔“

سرسید کی دقیقہ شناس، معاملہ فہم نگاہ ہندی کے حق میں شورش کے بنیادی مقصد اور اہمیت کو سمجھتی تھی حالانکہ ایک زمانہ تک ہندو مسلم دونوں اردو کو اپنی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو اردو کے ساتھ کچھ قدرتی یگانگت تھی انھوں نے فارسی کو چھوڑ کر اس زبان کو اپنا لیا تھا۔ اردو سے ان کا ایک قسم کا جذباتی وادبی لگاؤ و رشتہ قائم ہو گیا تھا اور اردو زبان عربی فارسی ترکی مقامی پر اکرتوں اور انگریزی الفاظ کا ایک ایسا ملغوبہ تھی جس نے ہندوستان کی مقامی آبادی اور مسلم ملت سب کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا تھا۔ ہندی کو رائج کروانے کے مطلب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہندو اس قدیم رشتے کو توڑ کر اپنی منفرد ایک الگ جماعت بنا کر خود کو نمایاں اور بلند کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اپنے ثقافتی ورثہ کے احیاء کی کوششیں اس مشترک ورثے میں تفریق پیدا کرنے کا باعث تھیں وہ ثقافت جو ہندو مسلم دونوں کے ملاپ سے صدیوں میں وجود میں آئی تھی۔ سرسید اس زمانے میں لندن میں مقیم تھے لیکن ہندوستان کی خبروں اور اردو کے خلاف شورش و ہنگاموں کی برابر خبر رہتی تھی۔ وہ نہایت فکرمند تھے کہ کہیں ہندو اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اپنے ایک خط میں بنام محسن الملک انھوں نے اس خدشے کا اظہار فرمایا ہے ”ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابوشیوا پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دلوں میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو و خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔“ سرسید سمجھ گئے تھے کہ اس لسانی مطالبے اور فساد کا آخر کار نتیجہ یہی نکلے گا کہ ہندو اور

مسلمان دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ سرسید کی اردو سے اس قدر محبت اور دلچسپی تھی کہ ایک زمانے میں انھوں نے ورنیکلر یونیورسٹی بنانے کی اسکیم بھی بنائی تھی۔ یہ اسکیم ایک عرضداشت کی صورت میں انھوں نے گورنمنٹ کو پیش کی۔ جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔۔۔ ”ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ ہونی چاہیے ہماری یہ مراد نہیں کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر تازہ کئے جائیں اور ان کی تعلیم ہو بلکہ ہم صرف اس بات کے خواستگار ہیں کہ جو علوم و فنون یورپ میں مروج ہیں انھیں کو شائع کیا جائے کیوں کہ بجز اس کے ہماری کوئی غرض نہیں ہے کہ اہل یورپ کی طرح روشن ضمیری تمام ہندوستان میں عموماً پھیل جائے۔۔۔ پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے تو اس درجہ کے علم تک اب صرف چند ایم اے کے سند یافتہ طالب علموں کی رسائی ہوتی ہے بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا اب جو سرحدیہ تعلیم غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے جاری ہے اس کی بدولت طالب علموں کو ایک مرتبہ حاصل کرنا ہے اس کو وہ یونیورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہے اور جلد اس کے ذہن سے وہ علم اُتر جاتا ہے مگر جو طریقہ ہم تجویز کیا ہے اس کے ذریعہ سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہو جائے گا صرف وہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کی تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں، وہ علم کی استعداد اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی و ترقی پاتا رہے گا۔“ اس عرضداشت سے ان کا مقصد نہ صرف تعلیمی غرض و غایت پر روشنی ڈالنا اور ایک ورنیکلر یونیورسٹی کا قیام جس سے تعلیم عام ہو بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح اردو کی علمی استعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور زبان ترقی و کامیابی کی طرف گامزن ہوگی۔ سرسید کی اردو ذریعہ تعلیم کے سلسلے کی کوشش قوم و ملک کی ترقی کے پیش نظر تھیں لیکن جب ہندوؤں نے اپنا الگ مطالبہ ہندی ذریعہ کا کھڑا کیا اور اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں حکومت کی بدلتی ہوئی نظریں دیکھیں تو انھوں نے اردو ذریعہ تعلیم کی تجویز ترک کر دی۔ سرسید ایک حقیقت پسند عملی فطرت کے انسان تھے۔ وہ نیک نیتی سے نہ صرف ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے کوشاں تھے بلکہ اردو کی علمی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ وہ اس کو اپنی زبان سمجھتے تھے ایک تقریر کے دوران انھوں

نے اردو زبان کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ ”میں نے جو ہر مقام پر اپنی زبان کے لفظ کا استعمال کیا ہے تو اپنی زبان سے میری کیا مراد ہے؟ میں اپنی زبان سے وہ مراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح مستعمل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو اور وہ اسی میں بات چیت کرتا ہو، خواہ وہ اس ملک کی پہلی زبان ہو یا نہ ہو اور اسی زبان میں ورنیکلر کے لفظ کا استعمال کرتا ہوں۔“

۱۸۸۲ء میں ہندوؤں نے اس لسانی فساد کا معاملہ تعلیمی کمیشن کے سامنے رکھا لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی، اس کی طرف سے یہ مطالبہ روز بروز زیادہ زور پکڑتا گیا جس پر صوبائی حکومت نے جن مخصوص مقاصد کے لئے اردو کا استعمال جاری کیا تھا اور انگریزی کو فوری طور پر جاری کرنا ناممکن نہ تھا وہاں اردو ہندی دونوں کو یکساں بنیادوں پر سرکاری زبان بنا دیا۔ اس فیصلہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون کی بجائے مخالفت کی راہیں کھل گئیں۔ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ جو عملی تجربہ مغربی علوم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کیا تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ تجربہ جس مقصد و جس نظر سے کیا گیا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں میرے خیالات یہ تھے کہ بذریعہ ترجموں کے جو اردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجے کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتا ہوں، اس پر کوشش کی اور ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی..... بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا..... میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ اردو زبان میں کتابوں کا ترجمہ ہونا بے شک ملک کے لئے مفید ہے مگر مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت جس کی ضرورت قوم کو ہے اور سوشل حالت کی ترقی اور حاکم و محکوم کا میل جول جو میرے اصولوں کا منشا ہے بغیر انگریزی پڑھے اور یورپین جینز و لٹریچر میں اعلیٰ درجے تک ترقی ناممکن ہے۔ سرسید نے لندن سے واپسی پر جب علی گڑھ کالج قائم کیا تو اس میں ”اورینٹل کالج“ کے نام ایک الگ شعبہ بھی قائم کیا اور دیسی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ تجربہ بھی ناکام رہا کیوں کہ اس زمانے میں انگریزی زبان کا زور اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہندوستان کی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں دب گئی تھیں۔ سرسید کا کہنا تھا کہ ”اردو گو ہماری مادری زبان ہے مگر اس کو درست کرنا اور اصلاح پر لانا اور اس کو ایک

علمی زبان کے درجے پر پہنچانا ہم مسلمانوں کا فرض ہے۔" ان کو اردو سے اس قدر دلچسپی اور لگاؤ تھا کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بستر عیال پر دراز تھے ہندوؤں کی طرف سے ایک میسرمل پیش کیا گیا جس کی رو سے ان کا مطالبہ تھا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں اردو زبان اور فارسی خط کی بجائے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ انھوں نے شدید بیماری کی حالت کے باوجود اردو کے تحفظ و بقا کے لئے آخری دم تک تحریک جاری رکھی اور ایک آخری مضمون وفات سے نو دن پیشتر لکھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس مخالفت کا مقصد تعصب پرستی پر محمول کیا۔ حریت فکر کا یہ عظیم مجاہد زندگی کے آخری لمحات تک اردو کی ترقی و بقا کے لئے جنگ کرتا رہا۔

۱۸۳۵ء میں اردو کو عدالتی اور سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی یہ بھی انگریزوں کی ایک سیاسی چال تھی انھوں نے فارسی کے تسلط کو ختم کرنے کے لئے اردو کو مہرہ بنایا کیوں کہ فارسی انھیں مسلمانوں کے دور حکومت کی یاد دلاتی تھی ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ایسی نشانیں کو صغیر ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے جن سے مسلمانوں کے دور عظمت کی یاد وابستہ ہو۔ وہ اردو کو سرکاری زبان بنا کر نہ صرف ہندوستانیوں کے ذہن و فکر سے فارسی کے اثرات ختم کرنا چاہتے تھے بلکہ مسلمانوں کی حیثیت کم کرنے، ان کو بے کار محض، تہی دست اور ہر طرح سے مغلوب و ناکارہ بنادینے کا بھی پروگرام تھا۔ وہ انگریزی کو فوری طور پر رائج نہیں کر سکتے تھے، حکومت کی چند سالوں کی سرپرستی اردو کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہوئی کہ جس طرح مغلیہ عہد حکومت میں فارسی درباری زبان ہونے کی وجہ سے اس کا اکتساب ضروری ہو گیا تھا اسی طرح اردو کو اچانک وہ مرتبہ و مقام حاصل ہو گیا جس کی بدولت اردو کی طرف بھی توجہ دے جانے لگی۔ انگریزوں کا اصل مقصد اردو کی آڑ میں انگریزی کے لئے سطح ہموار کرنا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اردو میں مختلف علوم کے سرمائے کا اضافہ ہونے لگا۔ قانونی مصطلحات اور دیگر علوم ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے اردو میں نئی نئی علمی اصطلاحات بھی داخل ہونے لگیں۔ انگریزی زبان کے سادہ، صاف پیرایہ اسلوب نے بھی اردو کو متاثر کیا۔ رفتہ رفتہ اردو اخبارات و رسائل بھی جاری ہونے لگے۔ ۱۸۳۶ء میں محمد باقر نے "اردو اخبار" کے نام سے ایک پرچہ نکالا سرسید کے بڑے

بھائی سید محمد خان نے ۱۸۳۷ء میں "سیدالآخبار" جاری کیا۔ جس میں زیادہ تر مضامین سرسید کے ہوتے تھے، ان پرچوں کی زبان سادہ اور صاف تھی اس زمانے تک اردو کو علمی زبان کا درجہ حاصل نہ تھا البتہ مدرسوں کی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج نے ترجموں کے ذریعے اردو کو سلیس و عام فہم بنانے کی ابتدائی، اولین کوشش کی تھی۔ ان کی یہ نثر زیادہ تر عربی و فارسی کے قصے کہانیوں کی کتابوں کے ترجمہ تک محدود تھی۔ ۱۸۴۰ء میں دہلی کالج میں نئی تعلیمی اسکیم کے تحت ذریعہ تعلیم اردو قرار پایا۔ انھوں نے نہ صرف اردو میں علمی ذخیرہ منتقل کرنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز کیا بلکہ اردو کو علمی زبان بنانے کی ابتدائی کوششیں کیں اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن دہلی کالج کی علمی ترقی کی جولان گاہ ان کے مدرسہ کے حلقہ اثر تک محدود تھی۔

۱۸۵۰ء میں مرزا غالب نے نثر کے میدان میں ایک نئی راہ نکالی۔ انھوں نے ایک خاص انداز اپنے خطوط میں اختیار کیا۔ جس سے خط میں مکالمہ و بالمشافہ گفتگو کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ ان کی ذاتی و شخصی کوشش تھی۔ اردو نثر کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا دائرہ فکر و عمل محدود تھا۔ سرسید کی علمی و ادبی تحریک کو فکر و تفکر اور وسعت اثر کے اعتبار سے ہندوستان کی تحریکوں میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ابتدا میں سرسید نے بھی نثر میں اسی قدیم روش کے مطابق ثقل منقہی و سجع پر تصنع پر تکلف فارسی آمیز اسلوب اختیار کیا۔ ۱۸۴۷ء میں دہلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات پر ایک کتاب "آثار الصنادید" کے نام سے لکھی۔ اس زمانے میں اردو کو عمومی حیثیت حاصل تھی۔ تصنیف و تخلیق کے لئے اسی قدیم فارسی طرز کو اختیار کیا جاتا تھا۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء میں "آثار الصنادید" کا دوسرا ایڈیشن سادہ طرز نگارش کی بنیاد پر شائع کیا جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سرسید مرزا غالب کے جدید نثری اسلوب سے متاثر ہوئے ہوں گے ان کے دوسرے ایڈیشن کی تحریر اس امر کی نشان دہی کرتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی تو مرزا غالب کو جدید انشا پردازی کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں ان کا کہنا تھا کہ "اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں اردو اخبارات کثرت سے شائع ہو رہے تھے اور انشا پردازی کو بھی ترقی ہو رہی تھی۔ ہر قسم کے مضامین لکھے

جار ہے تھے لیکن انشا پر داری کا کوئی خاص اسلوب و ڈھنگ متعین نہ ہوا تھا۔ سرسید نے نہ صرف اردو نثر نگاری کو تکلف و تصنع سے پاک کر کے ایک نئے اور عام فہم اسلوب کو رواج دیا بلکہ اردو نثر کے دامن کو جدید افکار، جدید نظریات اور جدید علوم سے بھی مالا مال کیا۔ ان کی تحریریں اردو کی تقریباً تمام اصناف ادب پر حاوی ہیں۔ انھوں نے اردو علم و ادب کا کوئی پہلو اور موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس پر انھوں نے کچھ نہ تحریر کیا ہو۔ انھوں نے اردو کو علمی زبان بنایا۔ حامد حسن قادری کا کہنا تھا کہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر اثر میں اتنی وسیع تصانیف کی ہوں۔ سرسید کی تحریروں اور تقریروں کا مقصد صرف تعلیمی و تدریسی نہ تھا بلکہ انھوں نے اجتماعی اعتبار سے قومی شعور بیدار کرنے اور جدید افکار کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ وہ قوم میں جمہوری نقطہ نظر کا احساس پیدا کر کے ایک ایسا ذہنی انقلاب لانے کے متمنی تھے جو قوم کے فکر و نظر میں جدید تغیر و تبدیل کا باعث ہو۔ تاریخ کے ایسے پیچیدہ موڑ پر سرسید نے تہذیب الاخلاق جیسا رسالہ نکال کر نہ صرف قوم کے مجموعی شعبہ زندگی کو متاثر کیا بلکہ نیا اور سادہ طرز اسلوب اختیار کر کے اردو نثر نگاری کا صحیح و سیدھا راستہ بھی بتایا اور اپنے عمل سے نثر نگاری کے بنیادی اصول بھی مرتب کر دیئے۔ زبان کو پستی سے نکال کر بلند مقام تک پہنچایا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت و اعتماد پیدا کیا سنجیدہ علمی و فلسفیانہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا۔ ان کے مضامین طرز نگارش کی دل آویزی کی وجہ سے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے بلکہ لوگ انتہائی اشتیاق سے ان کے رسالے کے منتظر رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ دیگر رسالوں اور اخباروں میں بھی اس قسم کے مضامین لکھے جانے لگے انھوں نے ایک نئے مقصدی نظریہ کو اہمیت دے کر اردو زبان و ادب کو زمانے کے واقعات اجتماعی سے ہم آہنگ کر دیا۔ قدیم ادب کا نظریہ 'ادب برائے ادب' یعنی تفریح طبع کا تھا۔ انھوں نے اس کو بدل کر اردو کی تمام اصناف سخن کو زندگی سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ ان کا نظریہ فکر، ادب کے متعلق یہ تھا کہ اردو علم و ادب کا تعلق ہماری زندگی سے ہونا چاہیے اور زندگی کی تمام اقدار عالیہ کا اس کو ترجمان ہونا چاہیے۔

”رسالہ تہذیب الاخلاق“ کے اجراء سے وہ قوم کے ذہن کو بدل کر جدید تعلیم کے

لیے آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ قدیم علمی نقطہ نظر کی اصلاح کر کے جدید ترقیات علمی کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ صرف انفرادی اصلاح بلکہ اجتماعی اعتبار سے تہذیب و شائستگی، اعلیٰ اخلاق و اطوار اور قومی عزت کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ادب و انشاء کا صحیح ذوق ابھار کے اردو کو قومی حیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنانے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے قدیم دینی نقطہ نظر کو جدید زاویہ سے بدل کر عقل و فہم سے سمجھنے پر زور دیا۔ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کو بہتر بنانے کے خیال کو فضیلت دی۔ عملی قوت کی اہمیت کا احساس دلایا۔ انھوں نے تحریروں کے ذریعے عقل و دانش کی برتری اور رہبری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تمدنی تعاون اور اتحاد کے فائدوں سے آگاہ کیا۔ مسائل زندگی کے حل کے لئے عقل کو رہبر بنایا جس سے اچھی بُری چیز اور نیک و بد میں تمیز کی جاسکے۔ قدیم عصبیت اور قدامت کا مشاہدہ کر کے روشن خیالی اور بلند نظری کے احساسات کو ابھارا۔ تہذیب الاخلاق اپنی قسم کا پہلا واحد علمی و ادبی رسالہ تھا جس سے اردو علم و ادب کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ اس نے مغربی افکار کو اردو کی دنیا سے روشناس کرایا اردو نثر نگاری میں انھیں اولیت کا مقام ہی حاصل نہیں بلکہ نثر نگاروں کا سر تاج اور جدید اردو نثر کا مورث اعلیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سرسید سے پہلے اردو ادبیات کا دائرہ مذہب، تصوف، تاریخ اور تذکرہ نویسی کے موضوعات تک محدود تھا۔ قدیم ادبیات سے قطع نظر جب سرسید کے علمی و ادبی سرمایے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے موضوعات میں کس قدر اضافہ کیا ہے، ان کے مضامین میں کتنا تنوع اور نیا پن ہے۔ ان کا انداز فکر و انداز بیان قدیم طرز فکر سے کتنا مختلف اور نیا ہے۔ انھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر ایسے نظریہ فکر کو مشعل راہ بنایا جس کے عقائد میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سرسید نے اردو ادب میں جو ذہن و فکر پیدا کیا اس کی بنیاد مادیت، عقلیت، خارجیت اور حقائق نگاری جیسے موضوعات پر ہے اور سب سے زیادہ زور ان کے مضمون میں عقلی توازن و اعتدال، عمل اور مصالحت پر دیا گیا۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی مقصدیت نمایاں ہے۔ سرسید نے اسلامی تہذیب کے صالح عناصر اور نئی تہذیب کے محاسن پر زور دیا وہ عوام کو ذہنی اعتبار سے نئی راہوں سے آشنا کر

کے ان کو نئی دنیا سے علم و فکر کی ہیر کرانا چاہتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کو اپنے افکار و علوم کے اظہار کا ذریعہ بنا کر ایسے علمی، اخلاقی، قومی اور معاشرتی موضوعات پر مضمون نگاری کی جدید بنیادیں اٹھائیں جس کے وجود سے اردو کا دامن خالی تھا۔ ان کی تحریروں میں صحیح معنوں میں علمی زبان کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے نہ صرف قومیت کا مفہوم ذہن نشین کرایا بلکہ نئے الفاظ و قوم، قومی ہمدردی اور خیر خواہی کا بھی اردو میں اضافہ کیا۔ انھوں نے قدیم روش سے جدا عالمگیر انداز پر اردو کو علمی و ادبی زبان بنانے کی راہیں بھی استوار کیں۔ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے سلسلہ میں اسٹیل وائیٹس کے پرچوں کا ذکر کرتے ہوئے طرز ادا کے بارے میں زبان کو ان پرچوں کے مذاق تحریر اور خیالات کے رنگ و ڈھنگ نے نئی تحریروں کے اسباب کو بجا دیا اور جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشا پر دازی کو جو کسبوں کے بناؤ سنگار کی مانند تھی اور رنڈیوں کے طعنے مینے یا لونڈیوں کی سی گالم گلوچ کو تحریروں میں سے بالکل دور کر دیا اچھی اور نئی تحریروں میں تیز کرنا اور سنجیدہ و متین نکتہ بینی اور مقصدیت کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت کو ترقی دی اور تحریر میں مناسبت اور تہذیب کا سبق لوگوں کے دل میں بٹھا دیا۔“

سرسید نے مغربی ادب کی تحریروں سے متاثر ہو کر اردو علم انشاء میں انقلاب انقلاب عظیم برپا کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں سادگی کو پیش نظر رکھ کر ذہنی عنصر پر زور دیا اور روزمرہ بول چال کی زبان کو وسیلہ بنایا۔ قوم کی اصلاح کے سلسلے میں زندگی کے شعبے اور موضوع پر انھیں غور و فکر کے ذریعے نئے راستے نکالنے پڑے ان کے ذہن و فکر میں اقتضائے زمانہ کے اعتبار سے تدریجی طور پر تبدیلی کا عمل جاری رہا۔ وہ ایک نظر، ایک خیال اور ایک مقام پر کبھی جامد نہ رہے جو بہتر صورت، جو بہتر راہ و وقت کی نزاکت اور ضرورت کے مطابق سمجھ میں آئی اختیار کی اور جب اس کی بھی صحت و ضرورت پر شبہ ہوا تو اس کو بھی تبدیل کر دیا۔ ترقی کے ارتقائی عمل کا یہی زیادہ صحیح و فطری طریقہ کار ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ پہلے وہ اردو ذریعہ تعلیم کے حق میں تھے بعد میں انھیں یہ نظریہ قومی مفاد کے خلاف محسوس کیا تو اپنا نظریہ بدل کر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے حصول پر پوری توجہ دی۔ بقول حالی وہ وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ جانتے تھے۔“ اسی طرح وہ ادب کے سلسلے میں چاہتے

تھے کہ ایسی نثر کی بنیاد رکھی جائے جو جدید زندگی کے تمام موضوعات کی عکاسی کا حق ادا کرنے میں مفید و موزوں ثابت ہو۔ سر جیمس الکل نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا کہ ”سرسید کی اردو جدید خیالات کی اشاعت کا آلہ ہے اس سے انھوں نے اس وقت کام لیا جب کہ نثر اردو کا وجود نہ تھا اور اس کو اس طرح بنایا اور برتا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔“ وہ طرز ادا کے سب سے بڑے راز سے واقف تھے کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ نثر نگاری کے لئے پانچ ایسی بنیادی خصوصیات ہیں جو نثر نگاری کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ سادگی، صفائی، اختصار، روزمرہ اور مزایہ وغیرہ سرسید نے اپنی تحریروں میں ان صفات کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ بقول احسن فاروقی ”سرسید کی نثر ایک دائمی تعمیر کی سنگ بنیاد ہے اردو نثر کا انھوں نے ایسا ماڈل پیش کیا جو ہمیشہ ایک معیاری طرح ہر اردو نثر نگار کے سامنے رہے گا۔“ انھوں نے اردو کی علمی تحریروں میں خلوص کے عنصر کو داخل کیا وہ سیدھے صاف اور سچے طریقے کے قائل تھے کیوں کہ اس کے بغیر وہ سچا اور حقیقی اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ان کا مقصد تھا۔ انھوں نے خیالات کے اظہار میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تمثیلوں، تلمیحوں، تشبیہوں، قصوں، لطیفوں اور برہنوں کا ہاتھ بھی کام لیا۔ ان کی تحریروں میں تصبیحات و علمی الفاظ کی ثقالت کے باوجود خشک اور غیر دلچسپ معلوم نہیں ہوتیں بلکہ مقصدیت کا جذبہ ان کی تحریروں میں فطری سلاست اور فصاحت پیدا کر دیتا ہے۔ دراصل یہ نثر کا سچا اور سادہ اصول ہے، قدیم و جدید واقعات کی تکرار سے ان کی تحریر میں ایسا لطف اور ایسا سماں پیدا ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا بلکہ ان کا طرز ادا واقعات کی صحیح تصویر پیش کر دیتا ہے۔ یہ ان کی قدرت بیان کا کمال ہے کہ جس موضوع اور جس صنف پر چاہیں ایک تسلسل اور روانی کے ساتھ بے ٹکان اظہار خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے علمی، سیاسی، تعلیمی، تاریخی، مذہبی، اخلاقی، لسانی اور ادبی موضوعات پر تقریری اور تحریری دونوں طریقوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ بقول حالی ”تاریخی مضامین میں دریا کی سی روانی ہے تو مذہبی و پولیٹیکل تحریروں میں دریا کی چڑھاؤ کی سی ترائی کا زور، اعترافات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی بے دلیل دعوؤں کے مقابل غرارت و خوش طبعی نصیحتیں نثر سے زیادہ دل خراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش، غصہ مہربانی سے پڑ لطف اور نفیس آفرین

سے زیادہ خوش آمد اخلاق کے بیان میں سعدی تو فیصلوں میں بیچ اور رواداروں میں سیکرٹری۔

لڑچکر سے جذبات کا خاص تعلق ہے سرسید کے بعض مضامین جذبات نگاری کی بہترین مثال ہیں مثلاً ”امید کی خوشی“ آدم کی سرگزشت، خاص طور پر ”امید کی خوشی“ میں جذبات کی فراوانی، تسلسل اور ساوگی عبارت ایک خاص قسم کا سماں اور لطیف پیدا کر دیتی ہے۔ ”امید کی خوشی“ میں لکھتے ہیں کہ ”اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جب کہ زندگی کا چراغ ٹھنڈا تا اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گری نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مژدنی چھا جاتی ہے۔ ہوا، ہوا میں پانی، پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو ترے ہی سہارے سے وہ ٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے اس وقت اس زرد چہرے اور آستہ آستہ ہلے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریامیں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور نیک نئی لازوال زندگی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔“ انھوں نے نثر نگاری کو قومی اصلاح کے لئے استعمال کیا تھا۔ تبلیغی نثر اردو میں پہلے بھی موجود تھی۔ لیکن عبارت ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا ملفو بہ معلوم ہوتی تھی جس سے نفس انسانی پر کچھ اچھا اثر مرتب نہ ہوتا تھا اول تو عبارت کا مفہوم ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس صورت میں تبلیغ اصلاح کا مقصد کہاں حاصل ہو سکتا تھا۔ سرسید کے پیش نظر بھی اصلاحی پروگرام تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے تبلیغی رنگ کو خوب نبھایا۔ بلکہ اوج کمال تک پہنچایا مثلاً ان کا مضمون ”رسم و رواج“ وہ بات، کو اس متاثر کن انداز میں شروع کرتے ہیں کہ قاری کے دل تک اُترتی چلی جاتی ہے۔ اس کا ذہن بھی جاگ اُٹھتا ہے۔ مصلحین اور مشاہیر قوم کی مثالوں سے مدد لے کر عبارت میں لطافت اور جذباتی رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ قاری کی قوت ارادہ کو اپنے قبضہ اثر میں کر لیتے ہیں اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہی سیاسی اور چچی فلاح کی راہ ہے اس کا دل اس کی گواہی دینے لگتا ہے۔ ان کا جادو اور خلوص و ہمدردی ان کی تحریر میں زور اور توانائی پیدا کرتا ہے۔ ان سے پہلے اردو میں مضمون نگاری کا وجود نہ تھا۔ سرسید نے

نہ صرف اردو میں مضمون نگاری کا اضافہ کیا بلکہ انھوں نے بے شمار مضامین لکھ کر اس صنف کو باقاعدہ رواج بھی دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی یہ اس زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جواب حد سے زیادہ ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں میکالے اور ایڈیسن کی سی ہو جائیں گی۔ انھوں نے فلسفہ الہیات کے مسائل کو اردو جیسی کم مایہ زبان میں انتہائی حیرت انگیز طریقے سے کمال خوبی سے بیان فرمایا۔ ان کی مشکل پسند طبیعت دقیق سے دقیق موضوع کو نہایت صفائی اور تکلف و تصنع سے پاک زبان میں ادا کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتی تھی۔ ان کے دماغ اور قلم میں یہ صلاحیت یہ اتم موجود تھی کہ موضوع کے اعتبار سے مناسب موزوں چچی تلی رائے کا اظہار کر سکے۔ ان کے مضامین میں بحث و مباحثہ و استدلال کا رنگ تک نمایاں ہے وہ جس موضوع اور جس مضمون پر اظہار خیال فرماتے تھے اس کی جزئیات کا پورا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایسا مدلل پیرایہ انداز اختیار کرتے تھے کہ قاری کو متاثر اور مطمئن کر دیتے تھے۔ ان کے ہاں تصنع کی بجائے خلوص و صداقت کے احساسات ملتے ہیں۔ ان کے مضامین مقصدیت کے تابع ہونے کے باوجود قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی علمی تحریریں بھی ایسی سادہ، سہل زبان میں ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ وہ مضمون کی ترتیب و تنظیم اور الفاظ کے دروست کا پورا خیال رکھتے تھے۔

سرسید کو نہ صرف مغربی افکار و اسالیب نے بے حد متاثر کیا تھا بلکہ ان کے اثرات ان پر اس قدر گہرے اور نمایاں تھے کہ وہ اردو میں بھی کچھ نئے نظریات و افکار داخل کرنا چاہتے تھے تاکہ اردو نثر و نظم انگریزی کی طرح ترقی کر سکے۔ انھوں نے اردو ادب کو جھوٹ، مبالغہ، لفاظی، خوشامد، تصنع اور ابتزال سے پاک کرنے کے مشورے دیے۔ انھوں نے انگریزی مضامین سے استفادہ کر کے انشا پر دازی کے طریقے بتائے اور انگریزی کے اعلیٰ درجے کے مضامین کو اردو میں اس ڈھنگ اور اس انداز سے اردو کا جامہ پہنا کر اردو خصوصیات کے ساتھ اردو میں داخل کیا کہ اصلیت کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی نثر نگاری و طرز ادا کا کمال ایسے موقعوں پر اور بھی نمایاں اور دیکھنے کے لائق ہوتا ہے جب وہ کسی علمی موضوع پر بحث و مباحثہ

[illegible]

کر رہے ہیں۔ اور وہ جس میں اللہ کا وہی دستور صادق اور بھی نکھلا ہے کی نگاہ الہی کے ہر بعد
مستطاب کی طرح لی اور مثالی سے جان کر رہے ہیں کہ وہاں صحت کا حق ہر ایک پر ہے۔ جیسے کہ جس کے
لیاواحت کا تکمیل اور وہ الہی مہارحہ میں بھی اور وہ الہی کے لیے ہے۔ جو حق کا "تفہیم" کے
موضوع پر ان کا سہمن انسانی کا تفہیم پر اور حلاوت کی کج کردہ سے اس میں واقفیتیں ہے
بلکہ اس کے بعد وہ کوکھتا اور اور کے سر میں پیشہ کے پانی کو ہر نکات ہے جس میں اور الہی
قوی کو کرکت میں لائے اور لفظ و کتاب کر کے سے لگتا ہے۔ جو ہم قاری آہو ہر
تقریبی دس صرف مختصر تقریبی بلکہ علم و کتابت میں بھی بدائع پارہا تھا۔ اس زمانے میں جتنا
دینی اور عارفی ہم طرز مہارحہ اختیار کیا ہے اس کا جتنی بڑھتی ہوئی کا کمال اور اور الہی
تصور کیا ہے اس کا تھا۔ حقائق کو زبان انسانی لیاواحت کی ترجمان ہوتی ہے لیکن انھوں نے اسے
تکلف و تصنع کے پردوں میں چھپا کر انسانی زندگی سے دور کر دیا تھا۔ سرحد نے اس طرز کی
ثقافت، غیر موزونیت اور غیر نظری انداز کو بھی دور کرنے کے طور سے دیا ہے۔ "جب ہم کسی
کے نکاح کو چھتے ہیں تو اس میں ایک بہت لمبا پیرا لگتا ہے وہاں بڑے پائے ہیں ان دونوں میں
صرف شاعرانہ الفاظ کا وصف کو تب الہیہ کے ہوتے ہیں جو در حقیقت کو تب الہیہ میں نہیں
ہیں حالانکہ کہ اللہ تب میں یا تو بیگانہ وار (اگر کو تب الہیہ بیگانہ ہے) کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے
جو خطبات کا شعر اور قاری کرنے کے لئے کافی ہو۔ یا اس دلی قیاس یا ادب کو نکال کر کرتا ہو۔
جو در حقیقت کو تب کو کو تب الہیہ سے ہو۔ اس رسم نے ایسا روانہ پایا ہے کہ درست دشمن
دولوں کے طرز تو قرآن میں کچھ فرق و امتیاز نہیں رہا ہے۔ نکل چھتے سے جدا الفاظ و جہت یا اشتیاق
کے اس میں لکھے ہیں ان کا کچھ بھی اثر دل پر نہیں ہوتا بلکہ ایک معمولی تحریر بھی جاتی ہے جو
دوست دشمن سب کو لگتی جاتی ہے۔ ان رسموں نے خط و کتابت کا جو سب سے بڑا نتیجہ ہے
اور حالت مفارقت میں محبت و اخلاص کے ازاد یا کارڈر پر ہے اس کو بھی بالکل خاک میں ملا
دیا ہے۔ "انھوں نے علم انشاء خط و کتابت میں قریب التفہیم یا مقصد و با معنی، سادہ و آسان
عبارت پر زور دیا۔ جس سے دلی جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی ہو۔ انھوں نے لسانی لفظ
نظر سے زبان کے مسئلہ کو بھی اہمیت دی۔ وہ جانتے تھے کہ وہی زبان زندہ کہلائے گی کی مستحق
ہے جس میں نئے الفاظ کا اضافہ بتدریج ہوتا رہے اگر زبان میں نئے الفاظ کے داخلے کے

جو شاعری کی محبوب صنف ہے محض مضحیہ خیالات اور احساسات کی ترجمان تھی۔ انھوں نے اس کو قید و بند کے محدود دائرے سے نکال کر زندگی کے وسیع موضوعات کو بیان کرنے کا مضور و دیا۔ فن شاعری کی خرابیوں کو بیان کیا۔ فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی ایک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تضحیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص ہو گیا ہے جس سے قہر تو بہت آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا فضا میں یا اس انسانی جذبہ جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جمالی حالت کا کسی چیز ایہ یا کاشیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔“

وہ شاعری میں بھی سادگی، اصلیت اور نیچے ل خیالات کے بیان پر زور دیتے تھے اور شاعری میں جموٹی تعریف، جھوٹے اوصاف اور فرضی خیالات کو اپنہ کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ و غزلوں، و سونختوں، و رسمہ تصنیدوں، و بحر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مشیوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھیننا نہیں چاہیے تھا نہیں، وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جو در سطح اور تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں مگر نقصان یہ ہے کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے دوسری قسم کے مضامین جو در حقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچے سے نکلتے رکھتے ہیں نہ تھے نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ جز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج بھی نہیں تھا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ جب پنجاب میں جدید شاعری کے سلسلے میں محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے ”انجمن پنجاب“ بنائی تو سرسید بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی رہنما کر لیا اور اہل پنجاب اس نقص کو رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۷ء کا وہ دن جب لاہور میں نچرل پونٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ

جائے۔ انھوں نے زبان کی پرورش و پرداخت اس کو دینا شروع کی اس کو فروغ دینے کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اس بات کا خود اعتراف کیا ہے، جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پتھروں کے ذریعے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اٹھایا کر لیا۔ جہاں تک ہماری کج راج زبان نے پاری دی۔ الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھر دی ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں تک رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ پر سیر کیا تک جو اس زمانے میں منطقی عبارت کہلاتی تھی یا قبح اٹھایا جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی، اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے، دل میں بیٹھے۔ سرسید کی نگری کوششوں سے نہ صرف خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی بلکہ اخباروں اور رسالوں کی عبارت نہایت عمدہ اور صاف سحر کی ہو گئی۔ وہ قدیم انداز عبارت آرمائی کا رواج کم ہو گیا۔ ہماری، مونے اور بھدے الفاظ سے بوجھ سے زبان آزاد ہو گئی۔ اس نئے اور صاف سحر سے انداز نے اردو میں جان ڈال دی۔ بقول مہدی آفاقی ”سرسید نے اس نوخیز بازاری یعنی کل کی چھو کری کو اس قابل بنادیا کہ اپنی نکتہ بہ نکتہ یعنی دنیا کی دیگر علمی زبانوں سے آنکھ لگا سکے۔ سرسید نے نثر و نظم کے سلسلے میں وسعت و بلند نظری اور طرز ادا کی سادگی پر زور دیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ زبان و ادب کے ذریعے ہی ذہنی انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔ علمی و مادی ترقی سے ہی آئندہ کے لئے روشن اور تیز نچر امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو زبان ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اگر زبان کی طرف توجہ دی جائے تو زیادہ خوبی اور صفائی و سادگی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کے ایک اگر پر دوست نے ان کو لکھا کہ تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں ہر قسم کے مضامین و خیالات، عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ سرسید نے اردو نظم کے متعلق بھی نئے خیالات، نئے انداز کو اختیار کرنے کا مضور و دیا۔ انھوں نے نظم میں غیر عاشقانہ و معجز خیالات کی جگہ نچرل اور مقصدی شاعری کو رواج دینے کی طرف توجہ دلائی۔ زندگی کے اصلی حقیقی موضوعات کو نظم میں داخل کرنے کی افادیت واضح کی۔ غزل

کی ترقی ہوئی بلکہ سرسید کی اس علمی تحریک نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا اور مسلمانوں کے دل، دماغ اور قلب و نظر میں بھی نئی روشنی پیدا ہوئی۔ پھر علامہ ابوالکلام آزاد نے ”الغلب خیال“ یہ سچے کر عوام کے ذہنی رجحانات پر چھتے بعد کیراثرات تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں بہتر و حسان پر سٹلر پاک و ہند کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔ اس رسالے کی بدولت اجراء سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ یقین سے یقین مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقہ اثر سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دورِ جدید کے بلند معیار نے اس خواندہ نعت سے نئے چہرے اور اسی کے حلقہ اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی تدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔ ”سرسید نے اردو ادب کی تاریخ کی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا جس میں ان تمام اردو زبان کی کتابوں کی فہرست مفصل ترتیب دینا چاہتے تھے جو ابتدا سے سرسید کے زمانے تک اردو میں شائع ہوئیں لیکن ان کی مصروفیات نے ان کو اس کام کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک ”آرڈیفٹ“ مرتب کرنے کا بھی انھوں نے قصد کیا جس کے چند صفحات ہی لکھ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو کی ایک ایسی مفصل نعت تیار ہوئی چاہیے جس میں ہر لفظ کے متعلق ہر طرح کی وضاحت کی گئی ہو۔ وہ زبان کی علمی ترقی، اس کی وسعت، اس کی اصلاح، اس کی حفاظت، اس کی درست زبان موضوع کے اعتبار سے اور اس کی اشاعت و فروغ کے لئے ہمیشہ سرگرم رہے۔

سرسید تحریک کی خاص شعبہ کے لئے مخصوص اور محدود نہ تھی بلکہ ایک جامع ذہنی تحریک کا نام تھا جس کا مقصد زندگی کے تمام شعبوں کو نئے افکار و نظریات کی مدد سے ایک نیا شعور دینا تھا۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے افکار کے حسین امتزاج سے ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا۔ دنیاوی معاملات کی اہمیت کا احساس دلایا۔ عقل، تجربہ اور مشاہدے کے اصولوں کو اپنا کر زبان و ادب کے نئے سانچوں کے ذریعے نئے خیالات کو پیش کیا۔ مقاصد جمیلہ کی گرمی شوق و جوش نے اردو کو گوشت و گم نامی سے نکال کر سچی سے بلندی تک پہنچایا اور خاص و عام میں مقبول بنایا۔ انھوں نے ماضی کی صالح روایات اور جدید تہذیب سے استفادہ کر کے اپنے وقت کی اچھی تعمیر کی اردو ادب کو درباروں اور خانقاہوں کی محدود و فصلا سے نکال کر تمام

”یاد ہے گا۔“

اچھا اور ساقی نے اس معاملے کے سلسلے میں جو مشورے دیے تھے، انھوں نے سرسید

کے بتائے ہوئے سادہ، اصلی اور سچے انداز کا کام اٹھایا کرنے کی اولین کوشش کی تھی۔

مولانا حالی کی مشوریاں ”حب الوطن، مناظر و رسم و انصاف“ پنجابی اخبار میں شائع ہوئیں۔

سرسید کا کہنا تھا ”در حقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہیں۔۔۔۔۔ وہ

مشوریاں، آداب زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں بیان میں زبان میں، آداب میں الفاظ کی ترکیب

میں، سادگی و صفائی میں ایسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔۔۔۔۔“ ان مشوروں کے دیکھنے

سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اگر شعرا مضمرات سچہ کی

طرف متوجہ رہیں اور ملٹن و شکسپیر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائیں اور مضامین مشقیہ اور

مضامین خیالیہ اور مضامین بیان واقع اور مضامین سچہ میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بھالیں

تو ان بزرگوں کے سبب ہمارے قوم کی لڑکچہ کسی عمدہ ہو جاوے گی اور ضروری وہ دن آئے گا

کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں گے جیسا کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور

شیکسپیر پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نظم کے

عمدد ہونے کا بھرپور احساس رکھتے تھے بلکہ تنقیدی شعور بھی تھا۔ ایک موقع پر مولانا

ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ ”اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ جدید اردو شاعری نے لاہور میں جنم

لیا۔ لیکن اسے اپنی نشوونما کے لئے علی گڑھ کی فضا راس آئی، نئے انداز اور جدید اسلوب کی

نظمیں اس شہر کے ادبی ماحول کی پیداوار ہیں۔ پہلی بار محمد انجمن کیشن کا نفرنس نے اس

انداز کا کام کو دنیا سے روشناس کرایا۔ وہ مغربی علم و ادب اور ان کی صنعتی و تجارتی ترقی سے بے

حد متاثر اور غمگین تھے۔ اپنے مضامین میں انھوں نے ان کی مثالوں سے زور پیدا کرنے

کی کوشش کی ان کا جذبہ صادق، خلوص و ہمدردی انھیں اس امر پر ابھارتا تھا کہ کسی طرح

مسلمانوں کے ضمیر کو بھینچ کر انھیں اعلیٰ ترقی و کامیابی کی طرف راغب کریں۔ ان کو کتنی تمنا

اور کتنی شدید فخر و شہرت تھی کہ یورپ ایسے عظیم غلام، ادبا اور شعرا ہماری قوم میں بھی ہوں اور

شہرت و دام پائیں جن سے مسلمانوں کی عزت و وقار میں اضافہ ہو تہذیب الاخلاق میں

چھپنے والی مختلف النوع مضامین کی بدولت نہ صرف اردو زبان کو فروغ ہوا اور اردو علم و ادب

پیداہی تھے اسی طرح اسپیکرنگ کی لیاقت بھی محض خدا داد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے تحقیق یا کچھ کے لکھنے یا پہلے سے اس کو تیار کرنے کے بالکل محتاج نہ تھے۔ سرسید نے نہ صرف اردو میں خطبات نگاری کے فن کو ایجاد کیا اور رواج دیا بلکہ اپنی تقاریر کے ذریعے زبان کی ترقی فروغ کے لئے وہ خدمت انجام دی جس کی بدولت اردو میں ہر قسم کے مطالب اور موضوعات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے زبان کی سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی، ملکی اور مقامی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ قوم و ملک کی ترقی کے لئے زبان کی بنیادی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے انھوں نے اردو کو تحریر و ترویج دونوں صورتوں میں افکار و نظریات اور قومی مسائل کے اظہار کے لئے استعمال کر کے زبان کی بنیادیں مضبوط و تر کر دیں۔ آل انڈیا کونگریس کونسل کا نفرنس کے قیام سے نہ صرف علوم و تعلیم کے لئے سازگار فضا پیدا کی بلکہ تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ہر طرح کے مسائل پر غور و فکر کا احساس پیدا کیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد اردو خطبات کی تربیت گاہ و راصل یہی کانفرنس ہے اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب علم و ادب کی خطیبا نہ صلاحیتیں پیدا ہوئیں۔ اس کانفرنس کے پیٹ فارم نے انھیں عوام سے متعارف کرایا۔ ہمیں حقیقت میں ان شخصیتوں کے نقوش اُبھرے۔“

~~~~~

دارو شاعر اور مصلح ہو گیا ہو۔ آج بھی اردو ادب میں ان کے اصول و نظریات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ جو کچھ کہنا یا بیان کرنا چاہتے تھے اس موضوع پر ان کے اندر خیالات کا ایک سمندر موجزن ہوتا تھا وہ بے شک ان مسلسل بڑی روانی کے ساتھ لکھتے اور بولتے چلے جاتے تھے۔ ان کا خلوص ان کا جذبہ بہبودی، نیر خواہی، اتحاد پسند اور موثر تھا کہ خیالات کا بہاؤ ان کو رکھنے ہی نہ دیتا تھا۔ عظیم مقصد کی چاشنی نے ان کے اندر زبردست عملی قوت کو ابھار دیا تھا۔ ان کے اندر ایسا یقین اور اطمینان پیدا کر دیا تھا جو کسی عام آدمی کا خاصہ نہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ان کی نثر نگاری کے رطب اللسان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”اسمید کی خوشی“ میں ان کا خاص رنگ نمایاں ہے۔“ اس رنگ میں ایک خاص آہنگ اور تازم ہے جو نثر کو بھی ایک خاص شاعرانہ اثر عطا کرتا ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ نثر بھی نظم کی ہم پلہ ہو سکتی ہے۔ سرسید کی فطرت میں جو پوشیدہ و ممانیت تھی اور جس کو وہ اپنی شعوری کلاسیکی رجحان کی بناء پر قابو میں رکھنا چاہتے تھے یہاں زور کے ساتھ نمایاں ہو کر اردو نثر نگاری میں ایک بنیاد کھولتی ہے۔ وہ محض یا بناوٹی بند بابت جو ان سے پہلے کے اردو نثر نگاروں میں فراوانی کے ساتھ تکلیف دہ حد تک نمایاں نظر آتی ہے یہاں ایک خاص تربیت کے تحت ضروری حد تک لطیف طریقہ پر پیش کی گئی ہے اور اس طرح آئندہ نثر نگاری کے لئے ایک راہ کھلتی ہے۔“ بقول ضیل الرحمن اعظمی ”ان کی بدولت اردو زبان میں تاریخی، سیاسی، مذہبی، فلسفی، انشائیہ، کہنویات، افسانہ نگاری، ادبی تنقید کا جو سرمایہ حاصل ہوا وہ اپنے مواد، اسالیب اور نقطہ نظر کے اعتبار سے ہمارے علمی ادبی خزانے میں اپنی نوعیت کا نیا اور منفرد اضافہ ہے۔“

سرسید نے نہ صرف سیاست، تعلیم، تہذیب و تمدن زبان، علم اور ادب کے متعلق جدید نظریات و افکار کو پیش کیا بلکہ اردو خطابت کا بہترین نمونہ خطبات کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا۔ مولانا حالی کا کہنا ہے کہ سید احمد خان پہلا شخص ہے جس نے اپنی ملکی زبان میں پبلک اسپیکنگ کی راہ نکالی نہ وہ اگر بڑی جانتا تھا جس میں بڑے بڑے مقرر روں اور فصحیوں کے لکچرروں اور اسٹیجوں کے نمونے موجود تھے اور نہ ان اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی۔ جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی جس طرح اس کے تمام اوصاف فطری اور